اردو زبان و ادب کے اعلام و مشاہیر

۱ ۔ اقبال اور غالب
۲ - اقبال اور شبلی و حالی
۳ - اقبال اور داغ دہلوی
۴ - اقبال اور اکبر الہ آبادی
۵ - اقبال اور سر عبدالقادر
۶ - اقبال اور سید میر حسن

10

علامہ اقبال اور مرزا اسد اللہ خان غالب

مرزا اسد اللہ خان غالب اردو زبان و ادب کی ایک عظیم المرتبت شخصیت گزری ہے۔ ان کا اصلی نام مرزا اسد اللہ بیگ خان تھا۔ مرزا نوشہ عرف اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان نظام جنگ خطاب باپ کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔ جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ ان ہی بطن سے غالب پیدا ہوئے۔ مرزا غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی) کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔(۱) بچپن میں یتیم ہوئے اور چچا نصر اللہ خان نے پرورش کی جب غالب آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہوئے اور نواب احمد بخش نے مرزا کے خاندان کے لئے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرادیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساری عمر ان کے ثنا خواں رہے۔ مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ خوش قسمتی سے ۱۸۱۱ء میں جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نو مسلم تھا بسلسلہ سیر و سیاحت وارد آگرہ ہوا۔ غالب نے دو سال تک اس سے تعلیم حاصل کی مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں :

"اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدائے فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے اس لئے ان کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی نام گھڑ لیا مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک فارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔"(۲)

مرزا کی شاعری کے بارے میں مولانا حالی لکھتے ہیں :

"مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ انہوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان

---

۱ غلام رسول مہر کلیات غالب فارسی (احوال) ص ۱

۲ مولانا الطاف حسین حالی یادگار غالب ص ۲۶

کے خاتمے میں تصریح کی ہے ۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔"(۱)
مرزا کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی اور ۱۸۱۲ء میں انہوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہکر دہلی میں سکونت اختیار کی ۔ مرزا کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اور آخر عمر میں حکیم محمود خان کے مکان کے قریب رہتے تھے ۔

اگرچہ فراخدالی کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے مگر معاش کی طرف سے وہ کبھی محتاج نہیں رہے ۔

غالب کی شاعری اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتی ہے انکی اردو شاعری فارسی کی طرح اول اول میں بیدل وغیرہ کے رنگ میں تھی ۔ چونکہ وہ طرز عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا ۔ اس وجہ سے ان کے احباب نے ان کو مجبور کیا اور آخر ان کو اپنا رنگ تبدیل کرنا پڑا ۔ اگرچہ اس رنگ کے چھوڑ دینے پر بھی ان کی شاعری نہایت بلیغ رہی مگر پھر بھی وہ پہلے کے مقابلے میں بہت آسان ہو گئی ۔ معنی آفرینی ، حسن بیان ، لطافت خیال ، ندرت بیان غالب کی خاص خصوصیات میں شامل ہیں ۔

غالب کی اہم تصانیف میں دیوان اردو ، اردوئے معلیٰ ، عود ہندی ، لطائف غیبی ، تیغ تیز ، قاطع برہان ، درفش کاویانی ، سبد چین ، دستنبوے ، پنج آہنگ ، مہر نیمروز ، کلیات نظم فارسی شامل ہیں ۔

مرزا غالب نے ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۔ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی ۔ نواب الٰہی بخش معروف کے خاندانی قبرستان بستی نظام الدین میں دفن ہوئے ۔(۲)

مرزا غالب نے نہ صرف اردو ادب اور شاعری میں کمال حاصل کیا بلکہ فارسی شاعری میں بھی وہ ایک انفرادیت کے مالک ہیں اگرچہ غالب اردو شاعری ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے مگر خود انہیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا :

---

۱ مولانا الطاف حسین حالی یاد گار غالب ص ۱۲۱
۲ غلام رسول مہر احوال غالب ـــ کلیات غالب فارسی ص ۷

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہء اردو کہ بے رنگ من است

دیگر مشاہیر کی طرح علامہ اقبال نے غالب کی عظمت کا اعتراف اپنے اردو اور فارسی کلام میں کیا ہے جسکی وجہ اقبال کی غالب مرحوم سے عقیدت اور احترام ہی ہوسکتی ہے ۔علامہ اقبال نے " بانگ درا " میں "مرزا غالب " کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھکر ان کی شعری خوبیوں کو سراہا ہے ۔اوران کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے ۔ علامہ اقبال کو کلام غالب اتنا پسند تھا کہ بقول صابر کلوری سفر میں ان کے ساتھ دو کتابیں رہا کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بستر پر یہ دو کتابیں رکھا کرتے تھے ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب ۔ (۱)

اقبال کو جہاں غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف رہا ہے وہاں وہ غالب کی شاعری کے فکری عناصر کے بھی قائل تھے چنانچہ وہ غالب کی شاعری کو جدید شاعری کا پیش خیمہ تصور کرتے تھے اور ان کی مجتہدانہ عظمت کے قائل تھے ۔اقبال کا اپنا کارنامہ بھی اس ضمن میں کافی وقیع ہے انہوں نے فلسفے کے دقیق پیچیدہ اور خشک مسائل کو شعر وادب کا موضوع بنا کر تازہ اور شگفتہ بنادیا ۔ اور اس معاملے میں کم از کم اردو کی حد تک وہ صرف غالب ہی سے رہنمائی حاصل کرسکتے تھے ۔اس بات کو ڈاکٹر عبدالحق یوں بیان کرتے ہیں :

" غالب صحیح معنوں میں اقبال کے پیش رو ہیں ۔ فکر و اسلوب کی یہی میراث تھی، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال نے بڑی عمارت تیار کی اور زبان و اسلوب کو اوج ثریا پر پہنچادیا ۔ اردو کے تمام شاعروں میں صرف غالب ہی اقبال کی رہنمائی کرسکے ۔" (۲)

علامہ اقبال غالب کی اردو شاعری کے علاوہ ان کی فارسی شاعری سے بھی خاصے متاثر تھے اور غالباً اس سے مستفید بھی ہوئے تھے ۔ چنانچہ ایک جگہ غالب کے فارسی کلام کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

---

۱ صابر کلوری اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک (تلخیص از احمد مصطفی صدیقی) مشمولہء ہما اقبال صدی نمبر ۱۹۷۷، ص ۱۰۴

۲ عبدالحق اقبال اور غالب مشمولہء اوصاف اقبال مرتبہ بہار الہ آبادی ص ۲۴۸

"میری رائے میں مرزا غالب کا فارسی کلام شاید مسلمانان ہند کی جانب سے وہ واحد پیشکش ہے جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے۔ غالب یقیناً ان شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے غالب شناسی کا حق ادا ہونا باقی ہے۔"(۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھ سکوں۔"(۲)

غالب پر علامہ کی پر درد نظم میں علامہ اقبال غالب کے اسلوب اور پیرائیہ بیان کی دلکشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

شاید مضمون تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
آہ ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہاں شیراز کے عظیم شعراء سعدی، حافظ اور عرفی سے بھی غالب کو بلند مقام عطا کیا گیا ہے اور اگر کوئی شاعر غالب کے برابر ہے تو وہ گوئٹے ہے جو گلشن ویمر میں خوابیدہ ہے۔ اس نظم کے تجزیہ میں ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں :

"غالب کی اہمیت اقبال کی نظر میں اس لئے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فطری روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا جس کے بعد جہاں آباد یعنی دہلی کے بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے گویا غالب کی قدر و قیمت اس لئے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا اور معیار شناس تھا۔ جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔"(۳)

---

۱ شذرات فکر اقبال ———— ص ۱۰۲

۲ ایضاً ص ۱۰۵

۳ عبدالحق ــــ اقبال اور غالب ــــ مشمولہ اوصاف اقبال مرتبہ بہار الہ آبادی ص ۲۵۲

اقبال کے دل میں غالب کی عظمت کا احساس ہمیشہ قائم رہا۔ "بانگ درا" میں غالب پر لکھی گئی اقبال کی نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اردو شاعری میں غالب کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"ابتدائی حالت میں اقبال کو غالب کی شاعری میں معنی کے بڑے بڑے طلسمات نظر آئے۔ ان کا اظہار ان کی نظم "مرزا غالب" (مطبوعہ بانگ درا) سے ہوتا ہے جس کے ہر شعر میں اقبال کو غالب شناسی اور غالب پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے دل میں غالب کے افکار کی عزت کسی رسم عام یا روش عام کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس سبب سے تھی کہ انہیں غالب کی شاعری میں ایک ایسا بڑا فنکار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات ہم رنگ تھے۔ انہیں مرزا غالب کی شخصیت اور فن میں اپنی ہی طبعی اور ذہنی خصوصیات کی جھلک نظر آتی۔"(۱)

اقبال مرزا غالب کے تخیل کی پرواز اور ان کی فکر کی بلندی کے معترف تھے۔ چنانچہ غالب کے کلام میں اس وصف کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

فکر انسان پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر تیرا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

غالب اور اقبال کے مماثلتی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"غالب کی شاعری کو اقبال کی منزل اول قرار دیا جاسکتا ہے ۔۔۔ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمود سحر کو طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔"(۲)

قوت متخیلہ کے علاوہ قدرت نے غالب کو شوخی تحریر اور غور و فکر کی طاقت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب اپنے کلام میں نئے نئے مضامین باندھنے میں مہارت رکھتے ہیں اور ان کی شوخی اور تحریر سے کلام میں زندگی پائی جاتی ہے۔

---

۱ ڈاکٹر سید عبداللہ ــــ غالب پیشرو اقبال مجموعہ اوصاف اقبال مرتبہ بہارالہ آبادی ص ۱۴۷

۲ ایضاً ص ۱۶۶

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں
محفل ہستی تیری بربط سے سرمایہ دار
جسطرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار

غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ان کے تخیل محاکات اندازبیان کی دلکشی کا ذکر کیاہے ۔ کلام غالب میں شرینی اسقدر نظر آتی ہے کہ غالب کے مقابلے میں حافظ اور سعدی کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے ۔ غالب کے اعجاز سخن کا اعتراف اس طرح کیا گیاہے :

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

غالب کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے علامہ ایک موثر انداز میں لکھتے ہیں :

ہائے ! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین
آہ ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ چین

علامہ اقبال اردو زبان و ادب کی ان عظیم شخصیات کی کمی کو بری طرح محسوس اور ایسی شخصیات کا ہونالازمی قرار دیتے ہیں :

گیسوئے اردو ابھی منت پزیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

علامہ نے اس نظم میں مرزاغالب کی زندگی اور سرزمین دہلی پر پردرد انداز میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے ۔ غالب کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ سرزمین دہلی سے یوں مخاطب ہیں :

اے جہاں آباد اے گہوارہ علم و ہنر
ہیں سراپا نالہ، خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں تیرے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیرے خاک میں لاکھوں گہر

دہلی ہمیشہ سے علم و ہنر کا مرکز رہی ہے اور اس میں بہت ساری عظیم شخصیات دفن ہیں ۔ علامہ نے اس مرثیہ میں نہ صرف غالب پر بلکہ دلی کی سرزمین پر بھی مرثیہ خوانی کی ہے ۔ اس لحاظ سے حالی کا مرثیہ حکیم محمود خان بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جسمیں حالی نے حکیم محمود خان پر لکھے گئے مرثیہ میں پوری قوم کا ماتم کیا ہے ۔ یہ مرثیہ بظاہر تو حکیم محمود خان پر لکھا گیا ہے مگر حقیقت میں یہ مرثیہ قوم کی تہذیب و ثقافت اور دہلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے ۔

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا نوحہ ہے ساری قوم کا

پر ملی ہم کو مجال نغمہ اسی محفل میں کم
راگنی نے وقت کے لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کے نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کی اقبال کا ماتم رہا

مذکورہ مرثیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نصرت اندرابی رقمطراز ہیں :

"حالی کا مرثیہ حکیم محمود خان بھی اس لحاظ سے اہم ہے ۔ اسمیں حالی نے دلی کی عظمت کو تاریخی اور سماجی تناظر میں پیش کیا ہے ۔ حکیم محمود خان کی موت کو موضوع بنا کر وہ مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی ترکی سے لے کر سمرقند اور بخارا سے لیکر دلی تک پھیلا دیتے ہیں ۔ یہ مرثیہ ایک شخص کا مرثیہ نہیں بلکہ مغل تہذیب اور دلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی قومی مرثیہ گو تھے چنانچہ شخصی مرثیوں میں کبھی ذاتی درد و غم کے ساتھ قومی زبان اور محرومی کا احساس شامل ہوتا ہے ۔ مرثیہ محمود خان کا بیشتر حصہ دلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے ۔"(۱)

اقبال نے بھی حالی کی طرح دلی کی سرزمین پر مرثیہ کہتے وقت غالب کی عظمت کا اظہار کیا ہے ۔ علامہ دلی کی سرزمین کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں :

---

۱ ڈاکٹر نصرت اندرابی ـــ پیامی شاعر حالی ' اکبر اور اقبال ـــ ایک تقابلی مطالعہ ' ص ۲۶۶

دفن تجھ میں کوئی فخر روز گار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

ان سوالوں میں دراصل غالب کی عظمت کا اعتراف ہے اور ان کے تئیں خلوص و عقیدت کا راز پوشیدہ ہے۔

اقبال نے غالب کی عظمت کا اعتراف نہ صرف اپنے اردو کلام میں کیا ہے بلکہ فارسی کلام میں بھی کیا ہے اس بارے میں احسن عبدالشکور لکھتے ہیں :

"پیام مشرق" میں مرزا غالب کو رومی، بائرن اور برؤننگ کی صف میں ایک منفرد مقام دیا ہے۔ یہ عقیدت مندی آخری دور کے کلام میں بھی موجود ہے۔ "جاوید نامہ" میں غالب کو ان مضطرب روحوں کے ساتھ دکھایا ہے جو مقام کی پابند نہیں ہو سکیں اور جن کے سوز دوام نے انہیں گردش جاودان کا خوگر بنادیا ہے۔"(۱)

علامہ اقبال نے غالب کا ذکر ابتداء سے آخر تک کافی احترام سے کیا ہے۔ "جاوید نامہ" میں فلک مشتری پر اقبال کی ملاقات غالب، منصور حلاج اور قرۃ العین سے ہوتی ہے۔ اس بات کا ذکر علامہ یوں کرتے ہیں :

غالب و حلاج و خاتون عجم — شور ہا افگندہ در جان حرم
ایں نواہا روح را بخشند ثبات — گرمی او از درون کائنات

علامہ اسی نظم میں ان تینوں ارواح جلیلہ کا ذکر یوں کرتے ہیں :

پیش خود دیدم سہ روح پاکباز — آتش اندر سینہ شان گیتی گداز !
در برشان حلہ ہائے لالہ گون — چہرہ ہا رخشندہ از سوز دروں !
در تب و تاب زہنگام است — از شراب نغمہ ہائے خویش مست !

ان اشعار اور "جاوید نامہ" میں غالب کے متعلق دوسرے اشعار، ان سے سوال و جواب اور ان کی ایک فارسی غزل کے منتخب اشعار کی نقل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شعراء میں اقبال سب سے زیادہ غالب سے متاثر تھے۔(۲)

---

۱ احسن عبدالشکور ــــ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ ــــــــ ص ۴۳۷
۲ عبدالمغنی ــــ اقبال اور غالب مشمولہ، اقبال اور مشاہیر مرتبہ طاہر تونسوی، ص ۶۸

"شعراء" موضوع کے تحت " پیام مشرق " میں بھی علامہ اقبال نے جہاں برونگ، بائرن اور رومی کا ذکر کیا ہے وہاں غالب کو ایک منفرد مقام عطا کر کے ان کی عظمت ظاہر کی ہے - یہ ان کے تئیں علامہ کی خاص عقیدت کا اظہار ہے چنانچہ زندگی کو پر کیف بنانے کے سوال کے جوابات ان حضرات نے اس طرح دئے ہیں :

برونگ

بے پشت بود بادہ سرِ جوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن

از منت خضر نتوان کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب

"تا بادہ تلخ تر شود سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

رومی

آمیزش کجا کہر پاک کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم(۱)

---

۱ علامہ اقبال ـــــ کلیات اقبال فارسی (حصہ پیام مشرق) ص ۱۷۵

علامہ اقبال اور مولانا حالی و مولانا شبلی

مولانا الطاف حسین حالی اپنے بیان کے مطابق تقریباً ۱۸۳۷ء پانی پت میں پیدا ہوئے(۱) قیام دہلی کے زمانے میں مرزا اسد اللہ خان کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اور ان کے بعض قصید ے انہیں سے سبقاً پڑھتے رہے اور جب حالی نے اپنی چند اردو فارسی غزلیں بنظر اصلاح پیش کیں تو غالب نے کہا اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔(۲)

حالی نہایت مخلص اور درد مند مسلمان تھے۔ انہوں نے سر سید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا۔ اور یہ کافی مقبول اور مشہور ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں حیات سعدی اور ۱۸۹۳ء میں مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوئی۔ یاد گار غالب ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی جو غالب کے کلام اور سوانح عمری پر تبصرہ ہے۔ یاد گار غالب نے غالب کی عظمت اور منزلت لوگون کے دلوں میں بٹھا دی اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر اس خوبی سے تبصرہ کیا کہ اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیاں واضح ہو گئیں۔ان کی تصویر اس طرح کھینچی کہ ان کی شخصیت جیتی جاگتی سامنے آ گئی۔

حالی کی سب سے بڑی تصنیف حیات جاوید ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اسمیں سر سید کے حالات زندگی اور کارناموں کا ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ ایک اعتبار سے یہ مسلمانوں کی تقریباً ایک صدی کی تہذیبی تاریخ ہے اس میں اس زمانے کی معاشرت ، تعلیم ،مذہب ،سیاسیات اور زبان وغیرہ کے مسائل زیر بحث آ گئے ہیں۔ اردو میں سوانح نگاری پر اس پایہ کی کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔(۳)

حالی نے مرثیے بھی لکھے جن میں غالب اور حکیم محمود خان کے مرثیے کافی اہم ہیں۔ مرثیے کے علاوہ غزل میں بھی ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔غزل کو انہوں نے حقیقت سے ہم آہنگ کیا۔ اسے سنجیدہ لہجہ دیا اور قومی و اجتماعی شاعری کی بنیاد رکھی(۴)۔ جدید اردو نثر

---

۱ رشید حسین خان (تعارف) مقدمہ شعر و شاعری ص ۵

۲ مولانا حالی یاد گار غالب مقدمہ

۳ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ہفتم ص ۸۲۶ (۴) ایضاً ص ۸۳۸

میں بھی حالی کا ایک بڑا مقام ہے۔ بقول نواب عماد الملک مولوی (سید حسین بلگرامی)

"ہماری زبانوں میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری اور نیم شاعری تھی۔ حالی نے سب سے پہلے متین اور حقیقت کی ترجمان نثر کی بنیاد ڈالی جو ہر قسم کے علمی و ادبی اور تنقیدی مضامین ادا کرنے کے لئے موزوں ہے۔"(۱)

۱۹۰۴ء میں حالی کو شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔(۲)

مولانا حالی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی بھی اردو زبان و ادب کی ایک عظیم شخصیت گزری ہے۔ شبلی ایک ہی وقت منطقی، فلسفی، مورخ، متکلم، ادیب، شاعر، نقاد، انشا پرداز مصنف لیکچرر، استاد، مدیر، سیاستدان اور عالم دین تھے۔ ابتدائی تحریروں میں مولانا شبلی ہی لکھتے تھے بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔(۳)

مولانا شبلی کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جس دن اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔(۴)

مولانا کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا وہ الہ آباد ہائیکورٹ میں وکیل تھے اور اس پیشہ میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے۔(۵)

شبلی اپنے تمام بھائیوں میں بڑے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور فیض الحسن سہارنپوری سے متاثر ہوئے۔

شبلی کی زندگی کے اہم واقعات میں اعظم گڑھ میں ایک نیشنل سکول کا قیام(۱۸۸۳ء) ندوۃ العلما کی تحریک اور ترقی۔ حیدر آباد میں قیام ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء اور سر رشتہ علوم و فنون اور انجمن

---

۱ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ہفتم ـــــــ ص ۸۳۸

۲ مقدمہ شعر و شاعری ـــــ تعارف رشید حسین خان ـــــ ص ۵

۳ سید سلیمان ندوی ـــــــ حیات شبلی ـــــــ ص ۶۸

۴ ایضاً ص ۲۸

۵ ایضاً ص ۶۲

ترقی اردو کی نظامت جنوری ۱۹۰۳ء ۔ دارالعلوم ندوۃ کی معتمدی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء الندوہ یعنی ندوۃ العلماء کے رسالے کی ادارت ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۲ء تمغہ مجیدی کا حاصل ہونا ۔ پاؤں کے زخمی ہونے کا حادثہ ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء قانون وقف علی الاولاد کی تجویز و ترتیب اور دوسرے بہت سے تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کی تجویز جس کے اکثر مراحل طے ہو چکے تھے (۱) کہ آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبحکو ساڑھے پانچ بجے بروز چہارشنبہ روح نے آخری سانس لی ۔ عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے کہرام برپا ہو گیا ۔ (۲)

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ اگرچہ شبلی کے خاص اطمینان کا زمانہ نہ تھا مگر تصنیفی لحاظ سے یہ دور کافی اہم تھا اس دور میں انہوں نے فارسی شاعری کی ایک مبسوط تاریخ شعر العجم کے نام سے پانچ جلدوں میں مرتب کی ۔

اردو نثر میں شبلی کو بلند مقام حاصل ہے ان کی نثر میں دبستان سرسید کی نثر کی اکثر خصوصیات پائی جاتی ہیں [مثلاً سادگی، بے تکلفی، بے ساختہ پن، استدلال، منطقیت وغیرہ] مگر ان کے نثری اسلوب کی اہمیت دراصل ان کے چند انفرادی خصائص کے سبب ہے ۔ ان کی تحریروں میں بڑا اعتماد علی النفس اور وثوق و یقین پایا جاتا ہے ۔ اعجاز ان کی نثر کا وصف خاص ہے مگر ان کی عبارتوں کے علمی وقار اور فاضلانہ رعب داب سے قاری پر بڑا اثر ہوتا ہے ان کے کلام میں جوش بھی پایا جاتا ہے ۔ ان کی نثر میں ان کی کئی صورتیں موجود ہیں ۔ ان میں اہم استعارے کا استعمال ہے جن کے ذریعے ان کے بیان میں مبالغے کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ۲

سرسید کی طرح ان کا امتیاز خاص یہ ہے کہ انہوں نے کتابیں بھی لکھیں جن میں بیشتر مستقل قدر و قیمت کی مالک ہیں ۔ مگر رفقا کی ایک ایسی جماعت بھی پیدا کی جو شبلی اکامی یا دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے نام سے آج تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہے اور ایک علمی مجلہ (معارف) کی اشاعت کے علاوہ ہر سال معیاری کتابیں لکھ کر اردو ادب کے ذخیرے کو مالامال کر رہی ہیں ۔

---

۱ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ ـــ جلد ۱۱ ـــــــ ص ۶۰۱

۲ سید سلیمان ندوی حیات شبلی ص ۷۲۵

۳ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۱ ص ۶۵۴

علامہ اقبال نے مولانا حالی اور شبلی دونوں عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر اپنی شاعری اور نثر میں بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے ۔ دونوں شخصیات نے اپنی گراں قدر خدمات کی بناء پر اردو ادب اور شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ۔ دونوں کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں :

"مولانا شبلی اگر اور کچھ بھی نہ لکھتے تو تنہا سیرۃ النبی انکو ابدالاباد تک زندہ رکھ سکتی ۔ مسدس مدوجزر اسلام بھی اکیلی مولانا حالی کو حیات جاوید بخشنے کے لئے کافی تھی ۔"(۱)

حالی اور شبلی دونوں نے اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کی اقبال مندی اور کمال فن کا اعتراف کیا ۔ دونوں نے جس کام کی ابتداء کی اقبال نے اسے آگے بڑھایا ۔ اور آگے بڑھتے بڑھتے دونوں بزرگ ہستیوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی عظمت کا بھی اعتراف کیا علامہ نے ان دونوں شخصیات پر ایک پر درد مرثیہ لکھکر دونوں کے مرتبے کا تعین کیا ہے ۔ دونوں شخصیات کے انتقال سے جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے علامہ اس پر گہرے تاسف کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کی موت کا صدمہ قوم کے لئے بار گراں ہے ۔ مسلماں قوم ایسی ایک ساخت کی وجہ سے بلند اور عظیم ہے اور کچھ شخصیتیں قوم کو آگے بڑھانے اور اس کی صحیح رہنمائی کرنے میں اپنی ہر ممکن کوشش بروئے کار لاتی ہیں اور جب اس نوع کی شخصیات قوم کو داغ مفارقت دے جاتی ہیں تو قوم کو ان کی کمی کا شدید احساس ہوجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے سہارا سمجھنے لگتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان قوم جدید فلسفے اور علوم جدید کی موجد ہے اور مختلف تہذیبیں اس قوم کی بدولت بنی ہیں ۔ مگر اس وقت قوم روبہ زوال ہے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں ضعف اس لئے پڑا ہے کہ تمام بزرگ اس دنیا سے رخصت ہورہے ہیں ۔ ان میں حالی اور شبلی قابل ذکر ہیں اور اگر کوئی شخص قوم کی اصلاح کرسکتا تھا وہ بھی ان بزرگ ہستیوں کا ماتم کررہا ہے ۔

خاموش ہوگئے چمنستان کے راز دار — سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان — حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

---

۱ محمد عبداللہ قریشی معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۸۶

علامہ ان دونوں شخصیات سے بے حد متاثر تھے ۔ دونوں علامہ کے خیالات کی سراہنا کرتے تھے حالی نے علامہ کی شاعری کی تعریف ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ اجلاس میں کی یہ یکم اپریل سے ۱۳ اپریل تک اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع صحن میں منعقد ہوا۔
اور اس اجلاس میں بہت سی شخصیات کے علاوہ الطاف حسین حالی ' سر عبدالقادر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابر موجود تھے ۔ جب علامہ نے "تصویر درد" نظم پڑھکر سنائی تو مولانا حالی نے علامہ کے کسی شعر کو پسند فرمایا اور علامہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے حالی نے انجمن کو دس روپے کا نوٹ دیا اس سے انجمن کو کافی فائدہ ہوا۔ جب مولانا حالی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو ضعف پیری کی وجہ سے ان کی آواز سامعین تک نہیں پہنچ سکتی تھی ۔ تو علامہ نے ہی یہ نظم پڑھکر سنائی ۔ اور اس نظم سے پہلے یہ رباعی پڑھکر سنائی ۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہو گیا
نازل ہے میرے لب پر کلام حالی (۱)

علامہ اقبال حالی اور شبلی کے قدر داں تھے کیونکہ دونوں کا مقصد قوم کی بھلائی اور بہی خواہی تھا حالی نے مد وجزر اسلام میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں ۔ حالی نے جدید شاعری کو جسکی بنیاد آزاد نے ڈالی تھی اپنے جنبش قلم سے مستقل اور نمایاں شکل دیدی حالی نے مسدس کو یاس اور غم پر ختم کیا مگر اقبال نے قوم کو نئی امیدیں عطا کیں اور مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلایا ۔ اس ضمن میں سلیم اختر کہتے ہیں :

"مولانا الطاف حسین حالی کے مسدس اور اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کا ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر اساسی نوعیت کی ایک بات واضح ہوجاتی ہے ۔ حالی اور اقبال دونوں نے مسلمانوں کو گزشتہ عظمت کا احساس کرانے کی کوشش تو کی لیکن حالی نے یاس اور ناامیدی پر مسدس ختم کی جبکہ اقبال "جواب شکوہ" میں رجائیت پر مبنی رویہ اپنائے ہیں ۔ اسمیں ان دونوں کے مخصوص تاریخی حالات اور سیاسی تناظر کا بہت

---

۱ باقیات اقبال سید عبدالواحد معینی ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی ــــ ص ۲۴۶

دخل ہے۔(۱)

علامہ اور حالی دونوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ قوم کو بیدار کر کے دنیا پر سبقت لے جانے کی تلقین کی جائے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حالی سر سید کے حامیوں میں تھے مگر اقبال کی آنکھیں مغرب کی چکا چوند روشنی سے کبھی خیرہ نہ ہو سکیں۔ انہوں نے پہلے مغرب کے سومناتھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد قوم کو یاس اور ناامیدی کی جگہ امید کا پیغام دیا۔

شاعر کی نوا ہو یا مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

حالی اور اقبال میں زماں و مکاں کا بہت فرق ہے دونوں قوم کے بہی خواہ ہیں۔ جس جدید شاعری کی بنیاد حالی نے ڈالی اقبال نے اسے آگے بڑھایا۔ دونوں کے مزاج میں مماثلت کے پہلو بھی ملتے ہیں۔

"دونوں کو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا شدید احساس تھا۔ دونوں قوم کی حالت پر ماتم کناں رہے دونوں نے مسلمانوں کی بہبودی کے خواب دیکھے"۔(۲)

علامہ نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا اور بہت آگے بڑھ گئے۔ حالی نے جہاں اپنی شاعری کا اختتام کیا اقبال نے وہیں سے اسکی ابتداء کی۔

"اقبال کی غزل گوئی حالی کی اصلاحی کوششوں سے بہت آگے بڑھ گئی اور پیغامبری کے منصب پر فائز ہوئی۔"(۳)

حالی نے غزل میں حقیقی زندگی کی عکاسی کر کے غزل میں نئی راہیں پیدا کر دیں۔ اور آگے چل کر یہی مقصد اقبال نے انتہائی درجہ تک پہنچا کر اس کو آسمان کی بلندیوں کے ساتھ چھونے کی بات کہی۔ اقبال کے سامنے حالی کی دی ہوئی ایک راہ تھی جسکی وجہ سے وہ آگے بڑھے۔ اسی

---

۱ سلیم اختر ــــ اقبال اور حالی مشمولہ مشاہیر اقبال مرتبہ طاہر تونسوی ص ۱۵۰

۲ ایضاً ص ۱۶۰

۳ محمد امین اندرابی ــــ حالی کے اثرات اقبال پر مشمولہ اقبال اور غزل مرتب محمد امین اندرابی ــــــــــ ص ۱۳۹

بناء پر علامہ نے حالی کے لئے مرثیہ کہکر ان کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔

علامہ نے حالی کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔ یہ اشعار ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو حالی کی صدسالہ برسی کے موقعے پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور اب تک کسی کتاب میں درج نہیں ہیں۔

مزاج ناقہ مانند عرفی نیک می بینم چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر می خواں

حمید اللہ خان اے ملک و ملت را فروغ از تو ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دارنم

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم

توبر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

ایک دوسرے موقعہ پر سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا :۔

آں لالہ صحرا کہ خزاں دیدو بفسیرد سید گراو را نمے از اشک سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز دنیا سود تالالہء شبنم زدہ را داغ جگر داد

۲۴ جون ۱۹۳۵ء (۱)

حالی کے ساتھ شبلی نعمانی کا ذکر بھی یوں عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتا ہے۔

علامہ نے مرحوم کے مزار کے لئے یہ تاریخی جملہ تجویز کیا

امام الہند والانژاد شبلی طاب نژاہ (۲)

علامہ شبلی بھی اقبال کی کافی قدر کرتے تھے چنانچہ ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک اجلاس مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اقبال کی گلپوشی کی رسم مولانا شبلی نے انجام دی تھی۔ اسی خوشگوار فریضے کو ادا کرتے ہوئے مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

"یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں۔ اور اسکو محض تفریح نہ تصور کرنا چاہیئے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ محقق طوسی وغیرہ

---

۱ باقیات اقبال ص ۲۴۶

۲ عبدالغفار شکیل نوادر اقبال ص ۳۳۰

کو ان کے زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دئے لیکن آج سوائے کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے۔لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا ہے۔وہ آج تک زبان زد خاص عام ہے جو عزت آج قوم کی طرف سے ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس کے مستحق ہیں۔"(۱)

اقبال کی پہلی کتاب علم الاقتصاد کا مسودہ علامہ شبلی کی نظر سے گزرا تھا مگر ہم ان کی اصلاحات کی پوری کیفیت سے آگاہ نہیں۔(۲)

اقبال شبلی کی شعرالعجم کے بے حد مداح تھے چنانچہ ظہور الدین مہجور کے نام ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا کہ شعرالعجم کے انداز میں کشمیر میں شعراء فارسی کی تاریخ لکھی جائے۔(۳)

شبلی کی سیرت النبی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

رات کو سیرت نبوی کا مطالعہ رہتا ہے۔مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احساس کیا ہے جسکا صلہ دربار نبوی سے عطا ہو گا۔(۴)

علامہ اقبال مولانا شبلی کے علم و فضل کے معترف تھے چنانچہ ایک مکتوب میں مولانا سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاد ذالکل ہیں۔"(۵)

ایک اور جگہ شبلی مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں :

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا"(۶)

---

۱ محمد عبداللہ قریشی معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۸۸

۲ ڈاکٹر محمد ریاض ــــ اقبال اور شبلی مشمولہ اقبال اور مشاہیر ' طاہر تونسوی ــــ ص ۱۲۷

۳ ایضاً ص ۱۲۹

۴ اقبال نامہ (شیخ عطاء اللہ (مرتب) (حصہ اول) ص ۸۵

۵ ایضاً ص ۸۰

۶ ایضاً ص ۱۴۳

علامہ اقبال حالی اور شبلی دونوں بزرگ ہستیوں کے کافی قدر دان تھے اس لحاظ سے ان دونوں شخصیات کا ذکر کافی احترام سے ملتا ہے۔ "بانگ درا" میں "حالی و شبلی" نظم میں علامہ نے اس عقیدت اور احترام کا ذکر یوں کیا ہے :

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا — دیوان جزو کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرود رفتہ کے نغمے علوم نو — تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موج نسیم بھی — نازک بہت ہے آئینہ آبروئے مرد
مردان کار ڈھونڈ کے اسباب حادثات — کرتے ہیں چارہ ستم چرخ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار — کیونکر ہوئی خزاں تیرے گلشن سے ہم نبرد
مسلم میرے کلام سے بیتاب ہو گیا — غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد
کہنے لگا دیکھ تو کیفیت خزاں — اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستان کے رازدار — سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان — حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد (۱)

حالی اور شبلی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال نے قوم کا حال بیان کیا ہے اور سوالیہ نشانات میں قوم کی پستی کی وجہ دریافت کی ہے جو قوم پہلے ہر شعبے میں بلندیوں کو چھو رہی تھی اس کے زوال کے اسباب دریافت کئے گئے ہیں۔ قوم کی عظیم المرتبت شخصیات (حالی اور شبلی) کی موت سے قوم کا صدمہ بیان کیا گیا ہے۔

اقبال کو داغ پر لکھے گئے مرثیہ میں ایک امید کی کرن حالی کی شخصیت میں موجود نظر آتی تھی۔ اور کہا تھا

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

مگر اب حالی کی موت سے اردو ادب میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو کبھی پر نہیں ہو گا۔ اور جو امیدیں حالی اور شبلی سے وابستہ تھیں وہ اب ختم ہو گئیں ہیں۔

---

۱ کلیات اقبال اردو _____ (حصہ بانگ درا) ص ۲۲۲

علامہ اقبال اور داغ دہلوی

داغ تخلص ، نواب مرزا خان نام ، دہلی کے محلہ، چاندنی چوک میں ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء (۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو بدھ کے دن دو بجے پیدا ہوئے ۔(۱)

مرزا نثار علی شہرت کہتے ہیں :

اصل نام ابراہیم تھا، شادی کے بعد احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا اور آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے ۔(۲)

والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی بیٹی تھی ۔(۳) داغ کے والد کا نام شمس الدین خان تھا ۔ داغ کے والد کے انتقال کے بعد انکی پرورش ان کی خالہ عمدہ نے کی ۔

۱۸۴۰ء میں وہ اپنی خالہ کے ہمراہ رامپور چلے گئے جہاں انہون نے مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات سے فارسی پڑھی ۔ ۱۸۴۴ء میں ان کی والدہ سے ابو ظفر بہادر شاہ کے بیٹے اور ولی عہد مرزا محمد سلطان فخر االملک (میر زا فخرو) نے عقد کر لیا ۔ نواب میر زا جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی ۔ قلعہ دہلی میں چلے آئے اور وہیں انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ۔ انہوں نے مروجہ فارسی کتابیں پڑھی اور سعید محمد پنجہ کش (م ۱۸۵۷ء) اور میر زا عباد اللہ بیگ سے خوش نویسی سیکھی ۔ علاوہ ازیں انہوں نے شہسواری اور مختلف ہتھیاروں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کی ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قلعے میں سکونت کے باعث وہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء سے متعارف ہو گئے ۔ جو قلعہ معلی کے شاعروں میں شریک ہوتے تھے ۔ اس ماحول میں ان کے فطری میلان نے جلا پائی وہ اوائل عمر ہی میں اردو غزلیں کہنے لگے ۔ جب شیخ محمد ابراہیم ذوق نے انہیں اپنی شاگردی میں لیا تو ان کی شعری صلاحیتیں پوری طرح چمک اٹھی

---

۱ مہتاب داغ ص ۲۶

۲ ایضاً (بحوالہ آئینہ داغ ص ۸۶)

۳ مہتاب داغ ص ۲۶

تھی ۔ ذوق سے تلمذ کا سلسلہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۴ء تک جاری رہا۔اس دوران داغ قلعہ اور شہر کے مشاعروں میں حصہ لیتے رہے ۔فخر الملک کی وفات (۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء) کے بعد وہ قلعے کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ۔اس کے دس ماہ بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا جس کے بعد داغ اپنے اہل و عیال سمیت ایک بار پھر رامپور پہنچ گئے جہاں یوسف حسین خان نے انہیں مہمان رکھا۔(۱)

۱۸۷۲ــــ ۱۸۷۳ میں داغ نے فریضہ حج بھی ادا کیا۔ ۱۸۸۷ میں ملازمت کرنے کے بعد داغ رامپور سے دہلی آئے اور پھر یہاں سے حیدر آباد پہنچے۔

جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ مطابق ۶ فروری ۱۸۹۱ء وہ نظام محبوب علی خان کے استاد مقرر ہوئے ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء اور حیدر آباد آنے کی تاریخ سے لے کر ۴۵۰ روپیہ ماہانہ سکہ ریاستی تنخواہ مقرر ہوئی جو ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کردی گئی ۔ ۱۸۹۴ء میں نظام کی طرف سے انہیں بلبل ہندوستان ' جہاں استاد ' ناظم یار جنگ ' دبیر الملک فصیح الملک نواب میر زاخان کے خطابات ملے ۔ دستخط میں وہ اپنا نام فصیح الملک داغ دہلوی لکھا کرتے تھے ۔(۲)

حیدر آباد میں آپ کو یہ صدمہ اٹھانا پڑا کہ آپ کی رفیقہ حیات ۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں رحلت کرگئی (۳) پھر داغ کی صحت خراب ہوگئی اور روز بروز بگڑتی گئی ۔ آخر فالج کا دورہ پڑا ' اطباء کی تدابیر ناکام رہیں اور ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء ۔بمطابق ۹ ذی الحج ۱۳۲۲ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اپنے بارے میں خود کہہ چکے تھے ۔

آج راہی جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا (۴)

داغ کے دیوان یہ ہیں : گلزار داغ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء آفتاب داغ لکھنو ۱۳۰۲ / ۱۸۸۴ء یادگار داغ جو ۱۳۱۰ھ سے لے کر ان کے سال وفات ۱۳۲۲ تک کے کلام پر مشتمل ہے ۔ مہتاب داغ حیدر آباد دکن ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء (۵) اسکے علاوہ ان کے مکتوبات میں انشائے داغ دہلی ۱۹۴۱ طبع احسن ماہر وی

۱　اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ　جلد ۹　ص ۱۶۲

۲　ایضاً

۳　مہتاب داغ　ص ۸۷

۴　ایضاً　ص ۸۸

۵　اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ　جلد ۹　ص ۱۶۲

زبان داغ ان کے ذاتی خطوط لکھنو ۱۹۵۱ احسن مارہروری بزم داغ لکھنو ۱۹۵۶ء کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔(۱)

داغ اپنی زبان کی پاکیزگی اور دلفریبی کلام کی روانی اور بے ساختگی اور اسلوب کی سادگی و نفاست کے لئے مشہور ہیں۔ یہ سب صفات غزل کے لئے بالخصوص موزوں ہیں۔ واردات حسن و عشق اور دیگر تجربات زندگی کا وہ جس فنکارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے اظہار کرتے تھے اس کا اثر سامعین پر براہ راست اور بڑا گہرا ہوتا ہے۔ان کا طرز بیان ایسا شیریں اور دلکش ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے وہ اپنے خیالات و جذبات کو جس انوکھے ڈرامائی اور بے باکانہ انداز سے جامعہ الفاظ پہناتے تھے اس کی نظیر دوسرے شعراء کے ہاں شاذ ہی ملتی ہے۔(۲)

علامہ اقبال نے داغ کا ذکر اپنے کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔علامہ اقبال داغ دہلوی کے شاگردوں میں تھے یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال زندگی بھر داغ کے مداح رہے اور ان کی شاعری پر نازاں بھی رہے علامہ اقبال نے شروع شروع میں داغ سے اصلاح لینی شروع کی۔ان دنوں داغ حیدر آباد دکن کے دربار سے منسلک تھے۔چند غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد داغ نے انہیں کہہ دیا کہ ان کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔چنانچہ داغ سے براہ راست تلمذ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ داغ کو بھی اس بات کا فخر تھا کہ اقبال بھی ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

"اقبال بھی ابتدائی غزل گوئی کے زمانے میں ان (داغ) کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کرلی۔ اس چیز کا اثر صرف ایک رسمی واقعے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلون کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے میں یہ تعلق بے حد کار گر ثابت ہوا۔ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ داغ کی سلاست اور اسلوب میں ایسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے ۔۔۔۔۔۔ اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی تھی۔ داغ

---

۱ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۹ ص ۱۶۲

۲ ایضاً ص ۱۶۴

کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہوگیا کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر مضامین کے تکرار کے سوا اس شاعری میں کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔" (۱)

اقبال کو داغ سے تلمذ حاصل تھا اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخندان کا

داغ اور اقبال کے ان تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے سرعبدالقادر دیباچہ "بانگ درا" میں لکھتے ہیں

"۔۔۔ جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلدی کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور سلسلہ تلمذ بہت دیر قائم نہ رہ سکا البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اسی غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کرلیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔" (۲)

داغ بجاطور پر اس مقام کے مستحق ہیں جو علامہ نے "بانگ درا" میں انہیں عطا کیا ہے چنانچہ علامہ جیسے بلند پایہ شاعر اور فلسفہ کو بھی اس بات کا صحیح احساس تھا کہ انکی عظمت میں جناب داغ کا بھی ہاتھ تھا۔

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
تیرے جیسے کو کر ڈالا سخندان بھی سخنور بھی

"بانگ درا" میں داغ پر لکھی گئی اس نظم میں علامہ اقبال نے داغ کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے ایک خاص نقطہ نگاہ سے داغ کی شخصیت اور ان کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ اور ان کی رحلت سے اردو شاعری میں پیدا ہوئے خلا کو محسوس کیا ہے اور

---

۱ عبدالقادر سروری جدید اردو شاعری ص ۲۱-۲۲

اس بات کی کمی پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ داغ کی بدولت اردو شاعری میں جو خوبیاں موجود ے تھیں وہ اب اردو شاعری کو نصیب نہیں ہوسکتیں ۔ داغ کا ذکر کرنے کے ساتھ علامہ نے اور بھی دیگر شعراء کا ذکر اس نظم میں کیا ہے ۔

"یہ نظم مخزن (اپریل ۱۹۰۵ء) کے یادگار داغ نمبر میں شائع ہوئی تھی اسکے چار بند تھے ۔ نظر ثانی کے وقت آخری بند کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پانچ بند بنائے گئے ۔ باقی نظم میں بھی کافی ترمیم و تنسیخ ہوئی جو شعر حذف کئے گئے وہ یہ ہیں ۔

جوہر رنگین نوائی پاچکا جس دم کمال پھر نہ ہوسکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر داغ یعنی وصل فکر میرزا درد میر
شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویران ہوا دیدہء خوں بار پھر منت کش درماں ہوا
کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ : دلسوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

مخزن اپریل ۱۹۰۵ء (۱)

مندرجہ بالا حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں :

"جب نظم کو "بانگ درا" میں شامل کرنے کا وقت آیا اور اقبال نے اس نظم میں مندرجہ خیالات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ دو شعر میر عقیدت کا نتیجہ ہیں اور ان میں مبالغہ کا وہی عیب موجود ہے جسے "غلو" کہتے ہیں اور جو داغ کی شاعری کا طرہء امتیاز سہی لیکن اقبال کی شاعری میں حلقہء بیرون در کی حیثیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ اقبال کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ داغ کا کلام مرزا غالب کی فکر اور میر تقی میر کے سوز و گداز کا مقام اتصال نہیں ہے نہ تو داغ میں "پر مرغ تخیل کی رسائی ہے" اور نہ میر تقی میر والی کیفیت گداز اس لئے انہوں نے دونوں شعر اپنی نظم سے خارج کر دئے ۔"(۲)

داغ کی شاعری میں متعدد خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کو ان کے یہاں ایک اور

---

۱ باقیات اقبال ص ۳۴۱

۲ جگن ناتھ آزاد، داغ اور اقبال کی غزل مشمولہ اقبال اور غزل مرتبہ محمد امین اندرابی، ص ۱۲۹

غیر معمولی خوبی نظر آتی ہے جو دوسرے شعراء کے یہاں ناپید ہے اور وہ ہے عشق کی حقیقی تصویر کشی :

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصور کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

یہی وہ کمال فن ہے جو علامہ کے نزدیک کسی اور شخص میں موجود نہیں یہ مرثیہ علامہ نے داغ کے انتقال پر ۱۹۰۵ء میں لکھا ۔اور غم واندوہ کا اظہار یوں کیا ہے :

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخی طرز بیان
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالہء بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روئے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

علامہ فکر مند ہیں کہ اب اردو زبان ان عظیم شخصیتوں سے محروم ہو گئی ہے ان میں غالب، میر مہدی مجروح ،امیر مینائی اور داغ جیسی بلند پایہ شخصیات شامل ہیں ۔

اے جہاں آباد اے سرمایہ بزم سخن — ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن
وہ گل رنگین تیرا رخصت مثال بو ہوا — آہ : خالی داغ سے کاشانہ اردو ہوا
اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا — یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

داغ کی شاعری میں بانکپن ، شوخی ، جذبات نگاری ، دلکشی اور جاذبیت کا ذکر کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں اشارے کئے ہیں ۔ داغ کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے رحلت

داغ پر لکھا ہوا یہ رقت انگیز مرثیہ اقبال کے کمال فن کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے ۔ آخری بند میں علامہ نے دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا اظہار کیا ہے ۔یہاں علامہ نے ۔بہار اور خزاں کی علامتوں سے زندگی اور موت کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے ۔

آرزو کو خوں رلواتی ہے ۔بیدار اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیاد اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زبان
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستان
ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اسیر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

آخری بند میں قانون قدرت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے ہر شے کو موت کا پیالہ پینا ہے ۔ زندگی کے بعد موت لازمی امر ہے " کل نفس ذائقتہ الموت " اسی حقیقت کو یہاں واضح کر دیا گیا ہے ۔اس قانون عالم گیر کی وجہ ہی سے داغ کی رحلت بھی ہوئی ۔

داغ کی تاریخ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ ھ ۔مطابق ۱۹۰۵ء کو ہوئی ۔علامہ نے مادہ تاریخ کہا نواب مرزا داغ (۱۳۲۲ھ) ۔یہ مادہ متعدد اصحاب کو سوجھا ۔حیرت شاہ جہانپوری نے یوں نظم کیا :

کیا شان کرم دیکھ حیرت — بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو کہر فلک کو انجم — جنت کو نواب میرزا داغ (۱)

داغ کی عظمت کا اعتراف اقبال نے نہ صرف اپنی شاعری میں کیا ہے بلکہ اس کا اظہار نثر میں بھی ملتا ہے ۔ چنانچہ اقبال نے احسن مارہروی کے نام ایک خط میں امیر مینائی کی تصویر کے ساتھ ساتھ داغ کی تصویر فراہم کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے ۔

" دونوں رسالے پہنچے ۔ سبحان اللہ ۔ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے ۔افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں بھیجی ۔انشاءاللہ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا ۔ ایک تکلیف دیتا ہوں اگر آپ کے پاس استاد ذی حضرت داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا ۔ بہت ممنون رہوں گا ۔ اگر آپ کے

---

۱ غلام رسول مہر سرودرفتہ ص ۲۱۷

پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ میں نے دنیا کے تمام بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کئے ہیں چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹووں کے لئے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہ عنایت جلد مطلع فرمائے۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹو بھی ضرورت ہے۔ والسلام۔" (۱)

اقبال کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین اندرابی لکھتے ہیں :

"ان کا سب سے پرانا خط جو اب تک دستیاب ہوا ہے ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا ہے جو احسن مارہروی کے نام لکھا گیا ہے۔ اس وقت اقبال طالب علم تھے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو اس وقت بھی ادب سے لگاؤ تھا اور شعر بھی کہتے تھے اور پھر یہ بھی کہ داغ دہلوی کی شاعری سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔" (۲)

غرض علامہ اقبال اپنے استاد داغ دہلوی کو کافی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم اور نثر دونوں میں داغ کا ذکر عقیدت سے ملتا ہے۔

---

۱ اقبال نامہ جلد اول ص ۴۰۳

۲ محمد امین اندرابی مطالعہ مکاتیب اقبال ص ۶۵

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

لسان العصر سید اکبر حسین رضوی' اکبر الہ آبادی کے نام سے معروف ہیں ۔ سید اکبر حسین صاحب ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق شوال المکرم ۱۲۶۱ھ کو موضع بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اکبر کی دادی نے جو نہایت روشن ضمیر اور روشن دماغ تھیں خواب میں دیکھا کہ اس بچے کا نام اکبر حسین رکھا جائے ۔ اور زچہ نے بھی دیکھا کہ ایک چاند میری گود میں آگیا(۱) اکبر کے والد کا نام سید تفضیل حسین عرف چھوٹے میاں تھا ۔ وہ صوفی منش اور درویش صفت بزرگ تھے ۔

ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۔ بچپن سے آخری ایام میں زندگی میں ترقی کرتے گئے شروع میں معمولی ملازمتیں کیں ۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ مدت تک وکالت کرتے رہے ۔ ۱۸۸۰ء میں جج اور بعد میں سیشن جج ہوگئے ۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف رہے ۔ ۱۸۹۸ء میں آپ کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا ۔(۲)

۱۹۰۹ء کو اکبر کی آنکھ کا اوپریشن ہوا اور ۵ جون ۱۹۱۳ء کو اکبر کے بیٹے ہاشم کا انتقال ہوا ۔ اس بات کا اکبر کو کافی صدمہ ہوا اور ان کی صحت کافی متاثر ہوئی ۔ اس سے پہلے ان کی بیوی بھی اس دنیا سے چل بسی تھی ۔ ان صدموں سے اکبر کی صحت خراب ہوتی رہی اور وہ مسلسل بیمار اور پریشان رہے اور آخر کار ۹ محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء تین بجے دن کو لسان العصر نے داعی اجل کو لبیک کہی ۔(۳)

بیماری کے دنوں میں موت کو اکثر یاد کرتے تھے ۔ رفیق اعلیٰ سے ملنے کی ایک تڑپ تھی ۔

---

۱ طالب الہ آبادی — اکبر الہ آبادی — ص ۱۸

۲ اردو انسائیکلو پیڈیا — ص ۱۴۰

۳ طالب الہ آبادی — اکبر الہ آبادی — ص ۳۹۴

سر جھکا کر یاد کرلیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار میں

مگر ان کی دلی آرزو تھی کہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے دنیا انہیں بھلا نہ سکے۔ وہ خدا سے اس کی توفیق مانگتے رہتے تھے۔

دعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یونہی مر کے رہ جاؤں گا (۱)

اکبر الہ آبادی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ قوم کی بلندی اور ترقی کے خواہاں تھے انہوں نے قوم اور ملک کو بیدار کرنے کی کافی کوشش کی اور بقول محمد عبداللہ قریشی :

"انہوں نے خیالات کی حریت اور فکر کی آزادی کا ایک خاص رنگ اختیار کر کے اپنے اشعار سے خوب کام لیا۔ ان کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھی۔ وہ بے غرض مصلح تھے اور اس حیثیت سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اب تک یاد کئے جاتے ہیں۔" (۲)

علامہ اقبال نے دیگر مشاہیر کی طرح اکبر الہ آبادی کا بھی ذکر اپنے کلام اور خطوط میں نہایت ہی عقیدت اور احترام سے کیا ہے۔ سر عبدالقادر اس بارے میں لکھتے ہیں :

"ہندوستان کے علمی دنیا میں جتنے بھی نامور اس زمانے میں موجود تھے مثلاً شبلی مرحوم، مولانا حالی مرحوم، اکبر مرحوم سب سے اقبال کی ملاقات اور خط و کتابت رہی۔" (۳)

اکبر اور اقبال کے روابط کے بارے میں غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں :

"اکبر اور اقبال کے روابط کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کا ملنا اب ذرا مشکل ہے۔ غالباً دونوں فنکار ایک دوسرے کے کلام کے ذریعے غائبانہ

---

۱ محمد عبداللہ قریشی ـــــ (اکبر الہ آبادی) معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۲۶
۲ ایضاً
۳ سر عبدالقادر ـــــ دیباچہ بانگ درا (کلیات اقبال اردو) ص ۱۲

طور پر پہلے متعارف ہوئے ۔(۱)

اکبر اور اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خطوط کی کافی قدر کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ملنے کے آرزومند بھی تھے ۔ دونوں کے خطوط سے ان کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اگرچہ خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو کافی خطوط لکھے ہوں گے مگر دونوں شخصیات کے درمیان لکھے گئے بہت کم خطوط اب تک دستیاب ہیں ۔

علامہ اقبال نے اکبر کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں سولہ خطوط شیخ عطاء اللہ کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ خطوط اقبال نامہ حصہ دوم میں شامل ہیں ۔ ان خطوط میں علامہ اقبال نے اکبر الہ آبادی کو اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے ۔(۲) یہاں وہ اکبر کو اپنا پر و مرشد(۳) کے علاوہ مرشد معنوی(۴) تصور کرتے ہیں اور کبھی موقع ملتا ہے تو دل کا دکھڑا اکبر کے پاس روتے ہیں ۔(۵)

دونوں کی مراسلت کے بارے میں محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں :

"دونوں کی مراسلت سے صرف چند خط ہم تک پہنچ سکے ہیں اور وہ بھی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے درمیانی عرصے کے البتہ ۱۹۱۰ء کے ایک انگریزی لیکچر میں ان کا ذکر ملتا ہے جو آغاز سرما میں اقبال نے اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا تھا ۔ مولانا ظفر علی خان نے اس کا اردو ترجمہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے مارچ اپریل ۱۹۱۱ء کے پنجاب ریویو میں شائع کیا پھر مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھکر سنایا جو خاص اسی مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا اور جس میں علامہ اقبال خود بھی موجود تھے اور بتایا کہ برعظیم کی اسلامی اور معاشرتی زندگی بالخصوص تعلیم

---

۱ غلام حسین ذوالفقار، اکبر پیش رو اقبال، مجلہ اقبال لاہور، اپریل ۱۹۶۳، جلد ۱۱ شمارہ ۴ ص ۲۲

۲ شیخ عطاء اللہ اقبال نامہ (حصہ دوم) ص ۳۴___۳۵

۳ ایضاً ص ۳۵

۴ خطوط اکبر بنام اقبال قاضی افضل حق قریشی نقوش اقبال نمبر ۲ ص ۵۰۲

۵ شیخ عطاء اللہ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۸

یافتہ بود کی ذہنی بیداری میں حضرت اکبر کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔"(۱)

اقبال اکبر الہ آبادی کا ذکر ایک جگہ یوں کرتے ہیں :

"جناب مولانائے اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر "لسان العصر" کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرائے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں۔ جو آج کل کے مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجے پر نہ جائے۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانہ، صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک آپ انکا مال خریدنے کے لئے ذوق سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔"(۲)

یہاں اس لیکچر میں علامہ نے پہلی بار اکبر الہ آبادی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد علامہ اور اکبر کے یہاں کافی خطوط ملتے ہیں۔ اقبال اکبر کے ان خطوط کی کافی قدر کرتے تھے اور انہیں محفوظ بھی رکھتے تھے۔

"آپ کے خطوط، جو سب میرے پاس محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔"(۳)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں :

" آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت سے لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔"(۴)

علامہ اور اکبر کے لکھے گئے ان خطوط سے نہ صرف ان کے باہمی تعلقات کی خبر ملتی ہے بلکہ ان کے خطوط میں مختلف مضامین ملتے ہیں۔ خیریت و مزاج پرسی، علالت پر اظہار تردد، شوق ملاقات اور متوقع ملاقات پر اپنی خوشی اور خوش نصیبی کا اظہار، لاہور آنے کی دعوت، موسم کی کیفیت

---

۱ محمد عبداللہ قریشی (اکبر الہ آبادی) معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۲۸

۲ ایضاً بحوالہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

۳ شیخ عطاء اللہ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۸

۴ ایضاً ص ۴۴

اعزہ و احباب کی یاد اور ان کے انس و لطف کا ذکر و خیر ۔ لاہور میں انفلوئنزا کی وبا کا ذکر اپنے سیاحت اور سفر کا حال اپنی اور اکبر کی ہم رنگی اور ہم مذاقی کا اعتراف ۔ اس نوع کے دوستانہ اور محبانہ کوائف ۔ مثلاً لاہور میں ہمدم و ہمراز کے نہ ہونے کی شکایت اپنے ہم خیالوں کی نایابی اور اپنی تنہائی کا رونا لاہور میں ضرورت اسلامی سے لوگوں کی ناواقفیت ' پنجاب میں صحیح قسم کے علماء اور صحیح اسلامی سیرت رکھنے والے نوجوانوں کا فقدان صوفیا کی ابتر حالت اور جمود پر افسوس ترکوں کی فتح ' دہلی دربار ' گاندھی جی کا خاموش مقابلہ ۔ کلکتے کا فساد ' پنجاب کا مارشل لاء لاہور کی مخدوش حالت وغیرہ ۔(۱)

علامہ اقبال کی مثنوی " اسرار خودی " ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ۔ اس مثنوی کی تعریف کرنے کے باوجود بھی بقول محمد عبداللہ قریشی(۲) اکبر کو اقبال کے مضامین مثلاً خودی ' تصوف اور حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور انہوں نے اسی بناء پر مثنوی کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ

"اقبال بادہء سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا درہ اٹھائیں بہ عوض اس کے ہم رندان بے سامان کے ساقی بنے رہیں ۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں ۔ ہم کو ان سے محبت ہے ۔(۳)

اس غلط فہمی کا سب سے زیادہ شکار خواجہ حسن نظامی ہوئے ' اس بارے میں علامہ کو وہ اپنا حریف قرار دیتے ہیں ۔ علامہ کو اخبار اور رسائل میں بھی بدنام کرنے کی کوشش ہوئی ۔ اس بارے میں اکبر آبادی کو لکھتے ہیں :

"خواجہ صاحب نے خواہ مخواہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیا کرام سے بدظن ہوں" ۔(۴)

پھر اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"خواجہ حافظ کے دیوان کے مطالعے سے میکشی بڑھ گئی ہے حالانکہ "اسرار خودی" میں

---

۱ محمد عبداللہ قریشی ـــ اکبر الہ آبادی ـــ معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۳۰

۲ ایضاً ص ۱۳۲

۳ مکتوب اکبر بنام مرزا سلطان احمد ص ۶۸ ـــ ۶۹ مشمولہ معاصرین اقبال کی نظر میں محمد عبداللہ قریشی ص ۲

۴ اقبال نامہ جلد دوم ص ۵۲

جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید ہے جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر (Popular) ہے۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہیں نہ ان کی شخصیت سے۔"(۱)

علامہ اقبال اکبر الہ آبادی کو مذکورہ مثنوی کو پورا پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں تا کہ اکبر ایک مسلمان (اقبال) پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔(۲)

دونوں کے درمیان تعلقات سدھر جاتے ہیں۔ دونوں کے درمیان غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ اکبر دوسرے احباب و اقارب کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے درمیان اکبر مصالحت کی بھی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اکبر خواجہ صاحب کو ۱۵ جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر صاحب نے "اسرار خودی" کے دیباچے میں شری کرشن جی کو قابل تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کی تعلیم کو برقرار رکھا ہے۔"(۳)

۱۹۱۲ء کے اوائل میں اراکین انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر علامہ اقبال نے حضرت اکبر کو انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اکبر نے معذوری کا اظہار کیا تھا لیکن خواجہ حسن نظامی کو لکھا :

"انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔ میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ نہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ شاید نجات پاسکوں۔"(۴)

مذکورہ اجلاس ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے وسیع گراونڈ میں منعقد ہوا تھا علامہ نے اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" اس اجلاس میں پڑھکر سنائی۔ یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ روزنامہ زمیندار نے ۱۱ اپریل ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں اس پر تعریفی شذرہ لکھا اور اس کے چند بند

---

۱ اقبال نامہ جلد دوم ص ۵۴

۲ ایضاً ص ۵۵

۳ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ص ۳۶

۴ ایضاً ص ۹ - ۱۰

شائع کئے ۔ حضرت اکبر نے یہ دیکھ کر ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء کو مندرجہ ذیل خط مدیر زمیندار کے نام لکھا جو ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظم کے دو تین بند جو زمیندار میں چھپے ہیں، میں نے دیکھے وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اس کی مدح کی جائے یہ رباعی پیش کرتا ہوں :

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور
یہ حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور
اوج ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور (۱)

نظم "شمع و شاعر" بانگ درا میں موجود ہے نظر ثانی کے وقت اقبال نے ساتویں بند کا یہ شعر قلمزد کر دیا۔

ملک ہاتھوں سے گیا، ملت کی آنکھیں کھل گئیں
سرمہ چشم دشت میں گرد رم آہو ہوا (۲)

۱۹۱۲ء کے اواخر میں اکبر اور اقبال کے مشترک دوست مرزا سلطان احمد نے جو ان دنوں ریاست بہاولپور میں مشیر مال تھے اپنی تصنیف فنون لطیفہ اکبر کی خدمت میں پیش کی ۔ اس میں شاعری، موسیقی، مصوری، فن تعمیر اور سنگ تراشی پر نہایت جامعیت سے بحث کرنے کے علاوہ اکبر اور اقبال کے اشعار کی تعریف کی گئی تھی ۔ یہ کتاب انہوں نے اقبال کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کی ۔

آداب ایشائی اقوام کے مطابق تحفہ، ہدیہ اور نذرانہ دینے کے واسطے پہلے سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس رواج کی پابندی سے مجھے حضرت ڈاکٹر محمد اقبال ایم ۔ اے بالقابہ سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس خلوص اور اس روز افزوں احترام اور محبت کے اعتبار سے، جو حضرت اقبال کی نسبت میرے ناچیز دل میں ہے ۔ میں یہ ادنیٰ نذر پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں ۔

---

۱ محمد عبداللہ قریشی ــــ اکبر الہ آبادی ــــ معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۱۵۰
۲ باقیات اقبال ص ۲۶۴

حضرت اقبال کی خداداد قابلیت، کشادہ دلی اور دوست نوازی سے امید کرنی چاہیئے کہ
مجھے شرف قبولیت سے ممتاز فرمایا جائے احقر سلطان احمد ۲۶ نومبر ۱۲ء " (۱)

اکبر نے اس کتاب کی رسید دیتے ہوئے ۲۴ دسمبر ۱۲ء کو مرزا صاحب کی خدمت میں لکھا۔

"میں کیا اور میرے شعر کیا۔ آپ کے تحسین سے حوصلہ افزائی ہوجاتی ہے ------
میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام پر اس کتاب کو معنون
کیا۔ حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرز ادا ہے۔ کیا
بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل، اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی
صدقے ہو۔ ان کا یہ مصرعہ

" در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند "

میں کبھی نہیں بھولتا۔ میں ان کی طرف سے بھی سپاس گزاری کرتا ہوں اگرچہ اب
تک مجھ کو ان سے ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ عجیب قید میں ہوں اس موسم میں
ناتوانی اجازت سفر نہیں دیتی۔ یہاں سردی تیز ہے۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں
تعطیل ہوتی ہے۔ اس وقت گرمی کی شدت ہوتی ہے دیکھے کب زیارت کا موقع ملتا
ہے۔ بہر کیف اس مطلع سے تسکین ہوجاتی ہے

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوالابصار کی
چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی (۲)

علامہ اقبال اور اکبر کی پہلی ملاقات جنوری ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ ایک خط میں اکبر مرزا سلطان احمد کو
۲۸ جنوری ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے
کو الہ آباد تشریف لائے تھے۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے ورنہ میری کیا ہستی

چل بسے اسباب غفلت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

---

۱ محمد عبداللہ قریشی ـــ معاصرین اقبال کی نظر میں ـــ ص ۱۵۱
۲ ایضاً بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ص ۴۴ـــ۴۵

ڈاکٹر اقبال صاحب بہ لحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الہیٰ میں سے ہیں ۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے ۔ وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم، فلاسفر، نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے ۔"(۱)

۷ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دونوں کی دوسری ملاقات ہوئی جس کا ذکر اکبر مرزا سلطان احمد کے نام ۹ ستمبر اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۱۰ ستمبر ۱۹۱۲ء کو کیا۔

بنام سلطان احمد

"پرسوں آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسلہ کانپور مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے ۔" (۲)

عبدالماجد دریابادی کے نام

"کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے دہلی گئے ۔"(۳)

۲۹ فروری ۱۹۲۰ء اکبر اور اقبال کی تیسری ملاقات ہوئی ۔ ۵ مارچ اکبر کے خواجہ حسن نظامی کو لکھا

"۲۹ فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے ۔ کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے مجھ سے ملنے کو اس طرف سے گزرے ۔ تین دن رہے ۔ ان میں میں نے بہت پولیٹیکل نشاط طبع پائی ۔ دنیا بہ امید قائم ۔"(۴)

۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں علامہ نے اکبر کے نام ایک خط میں یوں ذکر کیا :

"بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں اسے نوٹ کرے ۔ اگر میں الہ آباد میں قیام کرتا تو آپ کے لئے وہ کام کرتا جیسا باسویل Boswell نے ڈاکٹر جانسن Jhonson کے لئے کیا تھا ۔"(۵)

---

۱ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ۲۱ جنوری ۱۹۱۳ بحوالہ معاصرین اقبال کی نظر میں محمد عبداللہ قریشی ص ۱۵۲

۲ محمد عبداللہ قریشی معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۵۲ بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ص ۵۹

۳ ۔ ایضاً بحوالہ خطوط مشاہیر ۸۹

۴ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ص ۱۱۱

۵ خطوط اکبر بنام اقبال قاضی افضل حق قریشی نقوش اقبال نمبر ۲ ص ۵۰۷

اکبر کی وفات کے بعد مختلف لوگوں نے دہلی، لکھنو اور لاہور سے مکاتیب اکبر کے مجموعے شائع کئے۔ اقبال بھی اکبر کے ان خطوط کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے تھے جو اکبر نے اقبال کو لکھے تھے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے مرزا سلطان احمد اپنے مرتبہ مکاتیب اکبر کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں :

"سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی یہ آرزو رکھتے تھے کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام کے ہیں ان کا انتخاب مع مقدمہ شائع کیا جائے اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے۔ جیسا کہ مکاتیب اکبر خطوط اکبر دو مختلف مجموعے اس سے پہلے دہلی لکھنو میں شائع ہو چکے ہیں۔" (۱)

اقبال اکبر کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کی قدر کرتے تھے وہ انکے ہر لفظ کو پر معنی اور مفید جانتے تھے ان کی خواہش تھی کہ ان کو جمع کرلینا چاہیئے تاکہ آئندہ نسلیں فائدہ اٹھا سکیں۔ (۲)

حضرت اکبر کی روحانی تربیت سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ اجلاس میں چند ظریفانہ قطعات پڑھے۔ جو "اکبری اقبال" کے نام سے شائع ہوئے ان میں چند "بانگ درا" میں شامل ہیں باقی ترک کردئے گئے کچھ لوگوں نے اس پر اعتراضات کئے اور اقبال کو برا بھلا کہا۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں اکبر کو لکھا :

"آپ کا نوازش نامہ ملا۔ جس کو پڑھ کر مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اسکا مطلق اثر نہ ہوگا کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول حصول دولت وجاہ

---

۱ خطوط اکبر بنام اقبال قاضی افضل حق قرشی نقوش اقبال نمبر ۲ ص ۵۰۴

۲ ایضاً " " ص ۵۰۴

نہیں ۔ محض صداقت ہے ــــــ" (۱)

اکبر کو اکثر اقبال کا خیال رہتا تھا چنانچہ مرزا سلطان کے نام ۲۹ ستمبر کو لکھتے ہیں ــــ معلوم نہیں حضرت اقبال آج کل کہاں اور کس سوچ میں ہیں میں بالفضل پرتاب گڈھ میں ہوں جہاں میاں عشرت ہیں ۔(۲)

اسی طرح سر عبدالقادر کے نام ۲۱ مارچ ۱۹۲۱ء کو خط میں لکھتے ہیں :

"یہ تو فرمائے ڈاکٹر اقبال صاحب کیا کرتے ہیں عرصے سے خط نہیں آیا۔" (۳)

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ فوت ہو گئیں اکبر نے تعزیت کرتے ہوئے ایک نظم لکھی اور یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا جو آج بھی مرحومہ کی لوح مزار پر کندہ ہے

مادر مرحومۂ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہاں بے ثبات
گفت اکبر بادل پر درد و غم
"رحلت مخدومہ" تاریخ وفات (۴)

علامہ اقبال نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں حضرت اکبر کے دو اشعار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا

"نوازش نامہ ملا۔ دونوں اشعار لاجواب ہیں

فطرت کی زبان حسن کو سمجھو

سبحان اللہ ! یہ طرز اور معنی آفرینی خاص آپ کے لئے ہے کوئی دوسرا یہاں مجال دم زدن نہیں رکھتا اور دوسرا شعر

غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آتا کبھی موقع ہوتا ہے تو دل

---

۱ اقبال نامہ ــــ جلد ۲ ص ۴۰ ــــ ۴۱

۲ اکبر پیش رو اقبال ــ غلام حسین ذوالفقار مجلہ اقبال لاہور ۱۹۶۳ بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد

۳ ایضاً ــ ایضاً ــ ایضاً بحوالہ رقعات اکبر شیخ سلیمان ص ۱۲۸

۴ قطعات رباعیات حصہ اول مرتبہ احسان الحق شائع کردہ بزم اکبر کراچی، ص ۲۸۹۔
مشمولہ عہد معاصرین اقبال کی نظر میں مرتبہ عبداللہ قریشی ص ۱۶۱

کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں ۔ یہاں لاہور میں ضرورت اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں ـــــ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور خدا تعالیٰ نے مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں ۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی ـــ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے ـــ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں صرف ایک بے چین اور مضطرب جاں رکھتا ہوں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو ۔ مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں زیادہ کیا عرض کروں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو ۔" (۱)

۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء کے خط میں اقبال نے حضرت اکبر کے اس شعر

وائے بر بستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا :

"نہایت خوب ہے سیدھے ' آسان اور مختصر الفاظ میں حقائق بیان کرنا آپ کا کمال ہے عبدالماجد صاحب نے جو شعر آپ کا پسند کیا ہے نہایت خوب ہے ۔ میں نے بھی اس مضمون کا ایک شعر لکھا تھا ۔

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگی کو مگر
شمع بولی گریہ ، غم کے سوا کچھ بھی نہیں" (۲)

۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں علامہ اقبال اکبر کو لکھتے ہیں :

"ابھی تو مسلمانوں کو اور ان کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نہایت مخلص نوجوان لاہور میں ہے ۔ تاجر کتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ کو پھر شائع کرنا چاہیئے مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں ۔ میں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مصر ہے ـــــ تاہم

---

۱ اقبال نامہ جلد ۲ ص ۴۷ ۔ ۴۹

۲ ایضاً ص ۴۹ ۔ ۵۱

اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس شگفتگی طبیعت سے کم ہو گیا تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیں ۔ یہ لڑ کا آپ کا غائبانہ مرید ہے ۔" (۱)

اس خط کے جواب میں حضرت اکبر نے علامہ کو ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جو کچھ لکھا وہ بھی محفوظ ہے اور حاضر ہے دیکھئے اکبر کس مقام سے ارشاد ہدایت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں ۔

"پیارے ڈاکٹر صاحب ! آپ کا آخری خط ۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء اس وقت سامنے ہے آج کس قدر حواس درست ہوئے ۔ ایسی تکلیف اٹھائی بیان دشوار ہے ۔ معلوم نہیں کس گناہ کی سزا ملی کہ دو دن در بار بند رہا یعنی نماز بہ حالت انتشار ادا ہوئی ۔ قرآن پڑھوا کر سنا شدت درد سے ہوش پگھل رہا تھا مسہل سے افاقہ ہے ناتوانی زیادہ ہے دنیا کم نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ کو کیا خوشی ہو کہ ہندوستان میں صرف ایک شخص یعنی اقبال نے اس شعر کی داد دی :

جہاں بستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل عنصر سب کے سب آپسمیں لڑتے ہیں

_____ میں زیادہ نہ لکھ سکا ۔ قوت نظم اس وقت نہیں ہے آئندہ جو ہو سکے بے تکلفانہ آپ کو لکھ دیا ۔ خرافات ہو تو چشم پوشی کیجیئے خدایت یاد باد"!(۲)

اپنے پیر اور مرشد معنوی کے انتقال پر علامہ اقبال نے ایک پر درد مرثیہ لکھا ۔ یہ مرثیہ علامہ اقبال کے کلام " پیام مشرق " ۱۹۲۱ء کے ایڈیشن میں شامل تھا مگر بعد کے ایڈیشنوں میں حذف کر دیا گیا جسکی وجہ بقول مؤلف باقیات اقبال یہ ہو سکتی ہے کہ پیام مشرق میں علامہ کے پیش نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جنکا تعلق اقوام اور ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی

دریغا کی رخت از جہاں بست اکبر
حیاتش بحق بود روشن دلیلے

---

۱ اقبال نامہ جلد ۲ ص ۶۸ ۔ ۷۰

۲ محمد عبداللہ قریشی اکبر الہ آبادی معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۱۷۵

سر ذروہء طور معنی کلیمے
بہ بت خانہء دور حاضر خلیلے
نوای سر گاہ او کاروان را
اذان درای، پیام رحیلے
زدل ہا برافگندہ ای لات و عزیٰ
بہ جاں ھا نشا یندہ ای سلسیلے
دماغش ادب خوردہء عشق و مستی
دلش پرورش دادہء جبرئیلے (۱)

اکبر کی وفات پر اقبال نے مرثیہ کہا ہے اس سے جہاں اکبر کی فکری و فنی قدر و منزلت کا تعین ہوتا ہے وہاں اکبر اور اقبال کی ملی احساسات اور زاویہ ہائے فکر و نظر کی یک جہتی کا ثبوت بھی ملتا ہے یہ مرثیہ فارسی میں ہے اور اقبال کے فارسی مجموعہ کلام پیام مشرق کے ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں شامل تھا۔(۲)

اکبر الہ آبادی کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ علامہ اقبال نے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ایک تعزیتی خط ان کے صاحب زادے سید عشرت حسین کو لکھا۔ اقبال نے اپنی بد نصیبی اور محرومی کا ذکر یوں کیا :

"ابھی زمیندار سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مرشد معنوی) کے انتقال پر ملال کی خبر معلوم ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہوسکی۔ میں اور میرے ایک خاص دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہوجائے تو ان کی زیارت کے لئے الہ آباد کا سفر کریں۔ انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا بھی تھا کہ امسال ضرور ملنا ـــــ میری بد نصیبی ہے کہ ان کے آخر دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔

---

۱ باقیات اقبال سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۹
۲ غلام حسین ذوالفقار اکبر پیش رو اقبال مجلہ اقبال لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء

اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیاء میں کسی قوم کے ادبیات کو نصیب نہیں ہوئی ۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بخیل ہے ۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جاکے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے ۔"(۱)

کاش ! اس انسان کا معنوی فیض اس بد قسمت ملک اور بد قسمت قوم کے لئے کچھ عرصہ جاری رہتا ۔ خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ میں نے ایک تار بھی آپ کو دیا ہے ۔"(۲)

مولانا گرامی کو اقبال نے ۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اس بارے میں اس طرح لکھا :۔

"آخر ماحبیب تمنا تھی" اس مصرع نے مجھے بے ہوش کر دیا ۔ اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے ۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیات میں بھی کم بلند نہ تھا ۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی میں رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لئے ایک تڑپ تھی مگر گزشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے کوئی خط ایسا مشکل سے ہو گا، جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو ۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروس حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے ۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو ۔ میں نے تو یہ کلیہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا ۔ خدا ان کو

---

۱ مذکورہ خط انوار اقبال اور حیات اکبر میں شامل ہے دونوں میں یہ جملہ اس فرق کے ساتھ درج ہے ۔

انوار اقبال : زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جاکے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے ۔ ص ۱۹۷

حیات اکبر : زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب آکے اسے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے ۔ ص ۱۶۲

رحیم بخش شاہین امداد گم گشتہ

۲ کلیات مکاتیب اقبال سید مظفر حسین جلد ۲ ص ۲۷۳، ۲۷۴ ۔

انوار اقبال صفحات ۱۹۶ ۔ ۱۹۷

غریق رحمت کرے مسلمانان ہند کو اپنے اس نقصان کا پورا پورا احساس نہیں ہے۔"(۱)

علامہ اقبال نے "بانگ درا" میں بھی اکبر الہ آبادی کا ذکر یوں کیا ہے :

گرچہ تو زندانی اسباب ہے
قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلمان ہر گھڑی پیش نظر
آیۂ لایخلف المیاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیام ہے
ان وعد اللہ حق یاد رکھ (۲)

---

۱ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۱۷۷
۲ کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۲۸۲

علامہ اقبال اور سر عبدالقادر

سر عبدالقادر علامہ اقبال کے بزرگ ترین معاصرین میں شمار کئے جاتے ہیں ۔ وہ علامہ اقبال کے قریبی ساتھی تھے ۔ علامہ کے کلام کو دنیا تک پہنچانے اور ان کو دنیا سے متعارف کرنے میں "مدیر مخزن" نے خاص کام انجام دیا ۔ سر عبدالقادر ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۹ فروری ۱۹۵۰ء میں وفات پائی ۔ سر عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء میں اردو زبان کی خدمت کا جو بیڑہ اٹھایا اس کی خدمت میں اپنی کافی مصروفیات کے باوجود تقریباً نصف صدی تک اسکی اشاعت بڑی تندہی اور خلوص کے ساتھ کرتے رہے اردو ادب میں سر عبدالقادر کا نام اردو کے محسن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہے گا ۔(۱)

سر عبدالقادر اور اقبال کو اردو زبان سے ایک خاص لگاؤ تھا ۔ اس وجہ سے دونوں شخصیات میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہوا جو کافی دیر تک قائم رہا ۔ سر عبدالقادر علامہ اقبال کو ان عظیم شخصیات میں شمار کرتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی کے لئے کافی محنت کی ۔ چنانچہ اس بارے میں سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

"کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا ۔ جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا ۔ جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جنکی شہرت روم ایران اور فرنگستان تک پہنچ گئی ہے ۔"(۲)

کلام اقبال کے پہلے مجموعے کا مقدمہ بہت سے لوگوں نے لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر علامہ اقبال نے سر عبدالقادر کو ہی سب لوگوں پر ترجیح دی ۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

---

۱ پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح بانگ درا ص ۳۳۸

۲ سر عبدالقادر کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۹

"اقبال کا کلام جو وقتاً فوقتاً ۱۹۰۱ء سے لے کر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا اور انجمنوں میں پڑھا گیا اس مجموعے کی اشاعت کے بہت لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بارہا تقاضا کرتے تھے کہ اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا جائے مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعہ اردو شائع نہ ہوسکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقین کلام اردو کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی اور اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا ہے جو دو سو نوے بانوے صفحات پر مشتمل ہے اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۰۸ء تک کی نظمیں اور حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء سے آج تک کا اردو کلام ہے۔"(۱)

سر عبدالقادر علامہ سے پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں :

"۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے کچھ ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ ان سے ناواقف تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی سادہ سے الفاظ۔ زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔"(۲)

انہی دنوں ایک ادبی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس میں علامہ نے ایک نظم "کوہ ہمالہ سے خطاب" پڑھ کر سنائی۔ جس میں انگریزی خیالات۔ فارسی بندش اور وطن پرستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ ادب نواز حلقوں نے اس نظم کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اگرچہ علامہ اسکو شائع نہیں کرنا چاہتے تھے مگر سر عبدالقادر کے اصرار پر یہ نظم "مخزن" کے پہلے شمارے میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع ہوئی۔ اس بارے میں سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

"میں نے اردو ادب کی ترقی کے لئے رسالہ "مخزن" جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات ہوچکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالے کے حصہ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کرینگے۔ پہلا رسالہ

---

۱ سر عبدالقادر کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۷

۲ ایضاً ص ۱۶

شائع ہونے کو تھا میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی ۔ انہوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں ۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دیجئے اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے ۔ انہوں نے اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی اس لئے میں نے زبردستی ان سے وہ نظم لے لی ۔ اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع کردی ۔ یہاں سے اقبال کی شاعری کا گویا پبلک طور پر آغاز ہوا اور ۱۹۰۵ء تک جب وہ ولایت گئے یہ سلسلہ جاری رہا ۔"(۱)

علامہ اقبال کے کلام کی مختلف نظمیں مثلاً ترانہ ہندی ، جگنو ، صبح کا ستارہ ، ایک ہندوستانی لڑکی کا گیت ، قومی زندگی اس رسالے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں ۔ اس کے علاوہ مختلف خطوط اور اشتہارات اس رسالے کے ذریعہ لوگوں تک پہنچائے گئے ۔ مختلف مضامین بھی اس رسالے کے ذریعہ منظر عام پر آئے ۔ علم الاقتصاد دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہو کر تیار ہو چکی تھی ۔ اس کے اشتہارات دسمبر ۱۹۰۴ء میں مدیر مخزن نے شائع کرائے ۔

سفر یورپ کے دوران بھی علامہ اور سر عبدالقادر نے ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا ۔ یہاں اور بھی ان کے تعلقات مستحکم ہوئے ۔ دونوں علامہ اور سر عبدالقادر ۔ یہاں بھی قوم کی خدمات انجام دیتے رہے ۔ دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے اور مختلف موضوعات اور مسائل پر بحث اور تبادلہ خیال کرتے رہے ۔ چنانچہ ایک دفعہ جب علامہ اقبال نے یہ فیصلہ کیا کہ شاعری کو ترک کردیں گے تو سر عبدالقادر ہی کی وجہ سے علامہ نے یہ فیصلہ واپس لیا ۔ چنانچہ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

ایک دن محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کردیں گے اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے وہ کسی خاص کام میں صرف کردیں ۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی نہیں جسے ترک کیا جائے ۔ بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے ۔ اس

---

۱ سر عبدالقادر کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۳

لئے ایسی خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پائے کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب ترک شعر کے ارادے کو ترک کردیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ علامہ کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وہ وقت اس شغل کی نظر کررہے ہیں وہ ان کے لئے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لئے بھی مفید ہے۔"(۱)

جس طرح سے علامہ اقبال سر عبدالقادر کو عقیدت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی طرح سر عبدالقادر بھی علامہ کو کافی احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ علامہ کو سب سے بڑا شاعر مشرق اور فلسفی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ لندن کی لٹریری ایسوسی ایشن نے ایک دفعہ علامہ کے اعزاز میں والڈروف ہوٹل میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جسمیں لگ بھگ چار سو افراد نے شرکت کی اور اس میں ہندوستان کی چیدہ چیدہ علمی اور سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ طعام کے بعد ایک اجلاس منعقد ہوا جسکی صدارت سر عبدالقادر نے کی اس افتتاحی تقریر میں علامہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا :

"آج ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ سرزمین مشرق کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی ہمارے درمیان موجود ہے جس کے اعزاز میں ہم سب یہاں جمع ہیں۔" (۲)

یورپ کے سفر کے دوران علامہ کی شاعری میں ایک تبدیلی رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ علامہ نے اردو زبان کے بجائے فارسی کو وسیلہ اظہار بنایا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

"بظاہر ایک چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ کسی دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا کہ وہ فارسی اشعار بھی کہتے ہیں یا نہیں انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے

---

۱ سر عبدالقادر کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۱۶

۲ صابر کلوری اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک
تلخیص احمد مصطفیٰ صدیقی ہما اقبال صدی نمبر ۱۹۷۷ء ــــ ص ۸۴

سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔"(۱)

جن عظیم المرتبت شخصیات نے علامہ کو متاثر کیا یا پھر علامہ کے ان سے کسی طرح کے بھی مراسم رہے سر عبدالقادر کی عظیم شخصیت بھی ان ہی شخصیات میں شامل ہے۔ سر عبدالقادر نے علامہ اقبال کو کافی متاثر کیا۔ اس لئے علامہ اقبال نے "بانگ درا" میں "سر عبدالقادر کے نام" ایک نظم لکھی ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۸ء میں لکھی۔ یہاں سر عبدالقادر کو مخاطب ہو کر علامہ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم کو زندگی کے مقاصد سے آگاہ کرانا ضروری ہے ان میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پھر سے زندہ کرنا ہے اور وقت کی قدر کرتے ہوئے قوم کو اپنے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا کر جدوجہد کا سبق سکھانا ہے۔ علامہ اقبال نے سر عبدالقادر کو ہی قوم کی خدمات میں شریک ہونے کے لئے چنا ہے۔ تاکہ دونوں علامہ اور سر عبدالقادر ایک ساتھ مل کر قوم کی خدمات کا بیڑا اٹھا سکیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
جلوہ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

---

۱ سر عبدالقادر (کلیات اقبال اردو) دیباچہ بانگ درا ــــ ص ۱۶

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرہء شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بتکدہ چیں سے اٹھائیں اپنا
سب کو محو رخ سعدی و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقہ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدہء اغیار کو بینا کر دیں
ہر چہ در دل گزرد وقف زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع (۱)

اس کے علاوہ بھی علامہ اقبال نے "بانگ درا" کی ایک غزل کے مقطع میں سر عبدالقادر کا ذکر یوں کیا ہے :

"مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے" (۲)

---

۱ کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۳۲
۲ ایضاً ص ۱۳۴

علامہ اقبال اور مولانا سید میر حسن سیالکوٹی

علامہ اقبال کی بلند پایہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے والدین کے بعد ان کے اساتذہ کا بھی ہاتھ ہے۔ علامہ کو بچپن سے ہی نہایت قابل قدر اساتذہ ملے۔ ان استادوں میں شمس العلماء سید میر حسن کی عظیم المرتبت شخصیت بھی شامل ہے جنہوں نے علامہ کی زندگی کو چار چاند لگائے۔ ان ہی حضرات کی وجہ سے علامہ کو بچپن ہی میں ایک مستحکم بنیاد فراہم ہوئی اور وہ دنیا کی ایک عظیم شخصیت بن گئے۔

شمس العلماء مولانا سید میر حسن کی شخصیت نہایت ہی قابل قدر اور قابل احترام ہے ان حضرات کا ذکر علامہ نے اپنی شاعری کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ مولانا نے اپنی خاص مہارت سے اقبال کو اردو اور فارسی سکھائی جس کی وجہ سے علامہ نے ان دونوں زبانوں میں کمال حاصل کرلیا۔ علامہ کے والدین نہایت ہی نیک، دیندار اور مذہب پرست تھے۔ اس لئے علامہ کی تعلیم و تربیت بھی ایک خاص دینی ماحول میں ہی ہوئی۔ ملاحظہ ہو :

"اقبال ابھی چوتھی جماعت میں ہی پڑھتے تھے کہ ایک دن ان کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے پاس پہنچے اور کہنے لگے "مولوی صاحب ! میں سوچتا ہوں کہ اقبال آخر انگریزی کی تعلیم پاکر کیا کرے گا۔ اسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال اسکول جانے کے بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے۔"(۱)

علامہ کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ میر حسن نے ہی ابتداء میں ان کی صحیح تربیت کی ہے۔

"اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی اور جسے درمیان میں

---

۱ پروفیسر سید محمد عبدالرشید اقبال اور عشق رسول ص ۱۲

بحوالہ حیات اقبال ــــ ص ۱۱

داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے ۔(۱)

علامہ کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدین نے کوئی کسر باقی نہ رکھی ۔دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے مروجہ تعلیم میں بھی کمال حاصل کرلیا ۔اس کا سہرا بھی میر حسن کے ہی سر جاتا ہے جن کے مشورے پر ہی علامہ اقبال کو اپنے والد نے مشن ہائی سکول میں داخل کروایا ۔ مولانا سید میر حسن ایک قابل قدر، شفیق اور تجربہ کار استاد تھے ۔ جن کی رہبری علامہ اقبال کو بھی نصیب ہوئی ۔ سر عبدالقادر اس بارے میں لکھتے ہیں :

" سیالکوٹ میں ایک کالج ہے جس میں علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب علوم مشرق کا درس دیتے ہیں ۔ حال ہی میں انہون نے گورنمنٹ سے خطاب شمس العلماء بھی ملا ہے ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے ان کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کردیتے ہیں ۔ اقبال کو بھی اپنی ابتدائے عمر میں مولوی سید میر حسن سا استاد ملا۔ طبیعت میں علم و ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی ۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی سونے پر سہاگا ہو گیا ۔"(۲)

علامہ اقبال اور سید میر حسن کے درمیان تعلقات کا باقاعدہ آغاز شکاچ مشن سکول سے ہی ہو گیا اور یہ تعلقات آگے بہت مضبوط بھی ہوگئے اور آخر تک قائم رہے ۔

مولانا سید میر حسن سیالکوٹی کی پیدائش ۱۸ اپریل ۱۹۴۴ء کو فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی ۔ قرآن شریف کی تعلیم سید محمد صاحب سے حاصل کی اور ابتدائی کتب مولانا شبیر محمد صاحب سے(۳)

مولانا کی پیدائش کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

" علامہ مرحوم کے شاگردوں سے معلوم ہوا کہ آپ اپنا تاریخی نام "رونق بخش" بتایا

---

۱ سر عبدالقادر کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۲ ۱

۲ ایضاً

۳ قاضی افضل حق قرشی ــــ مولانا سید میر حسن اور اقبال ۔ اقبال کے ممدوح علماء، ص ۲۲

کرتے تھے ۔ اگر صحیح ہے تو آپ کی پیدائش کا سن ۱۲۵۸ء تھا اور اس اعتبار سے آپ نے نوے سال کی عمر پائی ۔" (۱)

مولانا کی پیدائش ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۴ء تک ہوئی اور تقریباً ۸۵ سال سے ۹۰ سال کی عمر پائی ۔ مولانا فارسی اور عربی زبان کے ماہر استاد تھے ۔ مولانا کے یہاں کافی شاگرد تھے ۔ آپ تمام شاگردوں کو نہایت شفقت اور محنت سے پڑھاتے تھے ۔ ان سے کبھی کوئی کام نہیں کرواتے تھے ۔ ایک دفعہ علامہ نے بازار سے آپ کے گھر کے لئے کچھ سامان لایا مولانا کو ناگوار ہوا اور کہا

" تمہیں کتنی بار کہا کہ بازار سے ہمارے لئے سودا سلف مت لایا کرو ۔ تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں ۔"

علامہ نے مسکرایا اور کہا

"جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں ۔" (۲)

مولانا نیک ' اخلاق کے اچھے اور وعدے کے پکے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے مشاہرہ پر سکاچ مشن سکول میں ملازمت شروع کی اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے اگرچہ بہت ساری جگہوں پر آپ کو اس سے زیادہ تنخواہ بھی پیش کی گئی مگر آپ نے انکار کیا اور کہا کہ اب مشن کو چھوڑ دینا آئین مروت شناسی کے خلاف ہے ۔(۳) مشن نے بھی آپ کی کافی قدر کی اور آخر تک پنشن مقرر کی ۔ مولانا کی کئی تصانیف ہیں مگر ان کے طبعی انکسار کے باعث آج تک زیر طبع سے آراستہ نہیں ہو سکیں ۔(۴)

علامہ اقبال کو سید میر حسن کا کافی احترام تھا یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا ۔ زندگی بھر ان کے سامنے میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا اور وہ بھی اتفاقی طور پر مولوی صاحب کسی کام کے سلسلے میں گھر سے نکلے ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا اور جس کا نام "احسان" تھا ان کے ساتھ تھا ۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا ۔ کچھ

---

۱ غلام رسول مہر ' شمس العلماء علامہ سید میر حسن سیالکوٹی کا انتقال ' نقوش اقبال نمبر ۲ ' ص ۶۴۹

۲ صابر کلوری ' اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر شاہی مسجد لاہور تک ' اقبال صدی نمبر ۶۱

۳ غلام رسول مہر ' شمس العلماء سید میر حسن کا انتقال ' نقوش اقبال نمبر ۲ ' ص ۶۴۹

۴ ایضاً

دور جا کے میں تھک گیا میں نے بچے کو دکان کی تختوں پر کھڑا کر دیا۔ اور خود ستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو الٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آکے فرمایا !

اقبال اس کی برداشت بھی دشواری ہے۔

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

تیرا احسان باری ہے۔ (۱)

علامہ اور سید میر حسن کے ابتدائی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

" علامہ کے والد محترم مولانا غلام حسین کے ہاں معارف دین کی سماعت کے لئے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں۔ اس لئے انہوں نے اقبال کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھادیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسین کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اقبال کو وہاں دیکھکر پوچھا۔ یہ کس کا بچہ ہے جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ اسے میں پڑھاؤں گا چنانچہ اقبال مولانا کے ہاں سپرد ہوئے اور وہ تعلق پیدا ہوا جو مدۃ العمر قائم رہا۔" (۲)

علامہ اقبال نے انہی تعلقات کی بناء پر مولانا سید میر حسن کا ذکر اپنے خطوط اور کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا گرامی کو لکھتے ہیں :

کم نہ شود خزانہ مدت بے نہائیست
یک دو نفس زیادہ کن غنچہ نیم باز را

مقصود یہ ہے کہ تیرے پاس وقت کا ایک لازوال خزانہ ہے پھر غنچہ کی عمر اگر تھوڑی سی زیادہ کردے تو اسمیں کمی نہ ہو گی۔ بہ نظر انتقاد ملاحظ کیجئے۔

" مولوی میر حسن صاحب کی خدمت میں بھی میں نے یہ شعر سیالکوٹ لکھا ہے دیکھیں

---

۱ فقیر سید وحیدالدین روز گار فقیر حصہ اول ص ۵۸

۲ عبدالمجید سالک ذکر اقبال ص ۱۱

ان کی کیارائے ہے۔"(۱)

مولانا کی عظمت کااعتراف کرتے ہوئے محمد بن عبدالرحمان شاطر مدراسی کے نام لکھتے ہیں :

"اگر آپ "اعجاز عشق" میرے کسی دوست کے نام ارسال کرنا چاہیں تو حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ کے نام ارسال کیجیئے۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ عالم اور شعر فہم ہیں۔ میں نے انہیں سے اکتساب فیض کیا ہے۔"(۲)

"اقبال اکثر کہا کرتے تھے کہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص نے عمل کی ہے تو وہ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی ہیں۔"(۳)

۱۹۱۳ء کا ایک واقعہ ہے جب ڈاکٹر اقبال صاحب انار کلی والے مکان میں رہتے تھے سید محمد عبداللہ ان سے ملنے کے لئے وہاں گئے تو علامہ نے فرمایا :

"عبداللہ جی یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم فلسفی نہیں Oriental accidental مستشرق یا مستغرب، جس سے میں نہ ملا ہوں یا کسی نہ کسی موضوع پر بے جھک بات نہ کی ہو لیکن نہ جانے کیابات ہے۔ شاہ جی سے بات کرتے ہوئے میری قوت گوئی جواب دہ رہ جاتی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے کسی نقطہ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے لیکن دل کی یہ بات بآسانی زبان پر نہیں لاسکتا۔"(۴)

علامہ مولانا کا کتنا احترام کرتے اس کا ثبوت اس بات سے فراہم ہوتا ہے جب علامہ اقبال کو گورنمنٹ کی طرف سے "سر" کا خطاب ملا تو علامہ نے یہ خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ ان کے استاد میر حسن کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔"۵

---

۱ محمد عبداللہ قریشی مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۱۶۲

۲ خطوط اقبال مرتب شیخ عطاء اللہ ص ۴۳

۳ فقیر سید وحید الدین روز گار فقیر جلد اول ص ۲۶

۴ قاضی افضل حق قرشی مولانا سید میر حسن اور اقبال مشمولہ (اقبال کے ممدوح علماء) ص ۲۶

۵ ملک حسن اختر اطراف اقبال ص ۱۴

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

"غالباً ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔ خطاب کی شان نزول بھی عجیب ہے ۔ سر ایڈورڈ مکلیگن سابق گورنر پنجاب نے ایک دفعہ علامہ سر محمد اقبال کو ملاقات کے لئے یاد فرمایا۔ باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ امسال حکومت کا ارادہ کسی مولوی صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا ہے اور آپ کی رائے میں کس کو دیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے استاد کا نام پیش کیا ۔ سر ایڈورڈ مولوی صاحب کو نہیں جانتے تھے ۔ پوچھا مولوی صاحب کی کوئی تصنیف ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اقبال" ۔(۱)

مولانا سید میر حسن کا انتقال ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء مطابق ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ کو ہوا۔ علامہ یہ خبر سنتے ہی سیالکوٹ روانہ ہوئے تا کہ نماز جنازہ میں شرکت کر سکیں ۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

"۲۵ ستمبر کی صبح کو یہ اندوہناک خبر تار کے ذریعہ علامہ اقبال مدظلہ العالی کو پہنچی ۔ آپ پہلی ٹرین سے سیالکوٹ روانہ ہوئے تا کہ نماز جنازہ میں شریک ہوسکیں ۔ مولانا میر حسن کی وفات کا صدمہ نہ صرف ان کے اعزہ و اقارب اور ہزارہا تلامذہ بلکہ تمام قوم کو ہو گیا جو ایک گراں مایہ ہستی سے تہی دامن ہو گئی ہے ۔"(۲)

قاضی افضل حق قرشی ان کے انتقال کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :

" ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا میکلوڈ والے مکان سے علامہ کو خبر ملی ۔ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے ۔ سیالکوٹ کی کوئی گاڑی نہ تھی ۔ مال گاڑی وزیر آباد جارہی تھی علامہ اسی میں گئے ۔"(۳)

علامہ اقبال نے اپنے استاد شفیق کے انتقال پر یہ مادہ تاریخ نکالا

ماارسلناک الا رحمۃ للعالمین

علامہ اقبال نے اس بزرگ ہستی کا ذکر اپنے کلام میں یوں کیا ہے :

---

۱ غلام رسول مہر شمس العلماء سید میر حسن سیالکوٹی ـــ نقوش اقبال نمبر ۲ ص ۶۴۹

۲ ایضاً

۳ قاضی افضل حق قرشی، مولانا میر حسن اور اقبال مشمولہ، اقبال کے ممدوح علماء، ص ۲۸

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہے (۱)

مندرجہ شعر اقبال کے متروک کلام میں درج ہے ۔ یہ غزل روز گار فقیر جلد دوم میں موجود ہے مگر اس غزل کا صرف مقطع "سرودرفتہ" اور ایک شعر "رخت سفر" میں شائع ہوا۔ (۲)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

"اٹھارہ اشعار کی یہ غزل "روز گار فقیر" میں شامل ہے لیکن اس غزل کے دو شعر اور کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ہیں "رخت سفر" اور "سرودرفتہ" اول الذکر کتاب میں یہ شعر درج ہے :

تعلق پھول میں گویا ریاض آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

اور ثانی الذکر میں یہ شعر

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں (۳)

"بانگ درا میں بھی علامہ اقبال نے "التجائے مسافر" عنوان کے تحت ایک نظم لکھی ہے جس میں میر حسن کے تئیں عقیدت کا اظہار ملتا ہے ۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر کہی ۔ یہاں علامہ مختلف خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معترف ہیں کہ یہ سارا فیض انہیں خاندان مرتضوی سے ہی نصیب ہوا۔

پھر آ رکھوں قدم مدر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھکو

---

۱ سرودرفتہ ص ۲۱۲ ،
ذکر اقبال ص ۲۷۱
۲ فقیر سید وحید الدین روز گار فقیر جلد (۲) ص ۵۰۳
۳ پروفیسر جگن ناتھ آزاد داغ اور اقبال کی غزل مشمولہ اقبال اور غزل مرتب پروفیسر محمد امین اندرابی ص ۱۱۹

وہ شمع بار گاہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ ہے کہ خداوند آسماں و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

علامہ اقبال کی خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں خود استاد میر حسن نے اپنا طالب علم بنایا اور اس بارے میں ان کو کوئی جستجو نہ کرنا پڑی۔ اور بقول فقیر سید وحید الدین

"اقبال اپنے استاد کے طالب نہیں مطلوب تھے"(۱)

اور پھر خاندان مرتضوی سے علامہ کو جو فیض پہنچا اس بارے میں ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں :

"دوسرا فکری اور تعمیری ماحول انہیں خاندانی مرتضوی کی بارگاہ کے آستانہ علم و دانش سے ملا جو اقبال کے لئے مثل حرم ہے جس کے نفس سے اقبال کی آرزو کی کلیاں کھلی ہیں جسکی مروت نے اقبال کو نکتہ داں اور نکتہ سنج بنادیا۔"(۲)

---

۱ فقیر سید وحید الدین روز گار فقیر حصہ اول ص ۲۱۱
۲ ڈاکٹر عبدالحق اقبال کے ابتدائی افکار ص ۷۰ - ۶۹